کچھ ہنسی نہیں ہے

اور

دیگر افسانے

از

علی عبّاس حسینی

ایم-اے

HaSnain Sialvi

پبلشر

انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

قیمت ۱۲/

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

HaSnain Sialvi

باہتمام کالی ۔ کے ۔ مترا، پرنٹر و پبلشر
انڈین پریس لمیٹڈ ۔ الہ آباد

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان افسانہ	صفحہ
۱	کچھ ہنسی نہیں ہے	۱
۲	پاگل	۳۶
۳	انتقام	۴۴
۴	ازالۂ غلط فہمی	۶۵
۵	جذبات لطیف	۷۴
۶	ہار جیت	۸۷
۷	باغی کی بیوی	۱۰۳
۸	بُندوں کی جوڑی	۱۱۳
۹	اچھوت برہمن	۱۲۷
۱۰	لیڈر	۱۵۸
۱۱	پیٹ	۱۶۴
۱۲	اندھی جوانی	۱۷۰

HaSnain Sialvi

HaSnain Sialvi

نمبر شمار	عنوان افسانہ	صفحہ
۱۳	خاموش! خاموش	۱۷۶
۱۴	روزہ	۱۹۳
۱۵	ردّ عمل	۲۰۱
۱۶	جواب	۲۱۰
۱۷	بھوک	۲۱۶
۱۸	نقل	۲۲۰
۱۹	کوڑا گھر	۲۲۴
۲۰	دو بچے	۲۳۳

HaSnain Sialvi

سنہ ۱۹۳۰ء

کچھ ہنسی نہیں ہے

مجھے علی کبیر موسوی کی اُس دن کی باتیں حرف بحرف یاد ہیں، جس روز ہم لوگ رام سیالا کے مندر کے سامنے اِملی کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ اس وقت کے مناظر قدرت کی طلسم کاریوں کا نمونہ تھے۔ مقابل میں پھلگوندی اور اسکے اوپر ریل کے دُو دُو پُل، داہنی جانب گیا کا شہر، اِسکے اردگرد متعدد پہاڑیاں، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بساطِ قدرت کے بچھانیوالے نے موقع موقع سے میز فرش رکھ چھوڑے ہیں، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سارا خطہ گیا سمٹ کر "بُدھ" کے قدموں میں آرہے۔ اور سارے نظام عالم میں رخنہ پڑ جائے۔

بائیں جانب کسی صاحبِ دل، روشن ضمیر کا بنوایا ہوا، برص کے مرضا کے لئے شفاخانہ، اُس کی بغل میں مستطیل و مربع کھیت، اور ان میں مٹر اور ہرا ہرا چنا۔ اُن کھیتوں میں جابجا کھجور اور تاڑ کے درخت۔ اِن درختوں کا اُتار چڑھاؤ اور اُن کے باقاعدہ کھڑے معشوق کی اُنگلیوں کی طرح سڈول اور

HaSnain Sialvi

خوشنما معلوم ہوتے تھے۔

ہم سب، یعنی مَیں (کاظم دلال) نوابزادہ حمید خراسانی، پرنس اختر گرویزی اور علی کبیر موسوی، اپنی اپنی طبیعت اور مذاق کے مطابق، اس منظر کی دیدہ زیبی سے لطف لینے لگے

پرنس اختر، جنکی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی تھی، دفعتاً حد درجہ افسردہ لہجے میں بولے۔ "خدا برا کرے ہندوستانی رسم و رواج کا کہ ایسا تو دلکش منظر ہے، اور میری بیوی اسے نہیں دیکھ سکتی!"

ہم سب پرنس کی اس بے ساختگی پر ہنس پڑے۔ اس زمانے میں انکے دل و دماغ پر انکی بیوی بے طرح مسلط تھیں۔ اور موقع بے موقع انکا ذکر وہ ضرور کرتے تھے، وہ ہم لوگوں کی ہنسی پر جھنجھلائے، اور ہمیں معقول کرنے کے لئے کہنے لگے۔ "اچھا بھئی تم لوگ ہنس لو۔ لیکن خدارا کبھی انصاف بھی کرو، اگر وہ غریب بھی ہمارے ساتھ یہاں تک آئی تو کون سا ہرج تھا؟۔ تازہ ہوا، بہترین فضا، پھر اس طرح کا منظر، کیا وہ انسان نہیں؟ کیا وہ زندہ نہیں؟ آخر کاہے کی عقوبت ہے؟ کس بات کی سزا ہے؟"

مَیں نے تو چپکے سے یہ کہہ کر "آدم کو خلد سے نکلوانے کی!" گفتگو کو سنجیدہ ہونے سے روکا، لیکن میاں موسوی بات کاٹ کر بولے۔ "ارے یار پرنس تم بھی ہندوستان میں ان باتوں کا ذکر کرتے ہو! میں تم سے سچ کہتا ہوں

کہ میں تمام دُنیا کی عورتوں سے نفرت کرتا ہوں اور صنف کی صنف کو حد درجہ ذلیل سمجھتا ہوں، مگر غریب ہندوستانی عورتوں پر تو مجھے بھی رحم ..... "

بھلا اس طرح کا مبحث ملے اور ہمجنسوں میں بات تمام ہو سکے، ناممکن! اس لئے علی کبیر صاحب موسوی ایم، اے۔ (کینٹب) کا نظریہ ناتمام ہی رہا کہ میں نے اپنے خاص انداز میں جسے احباب "بھیگی بلّی والا انداز" کہتے ہیں، ان سے پوچھا " اچھا تو خیر سے آپ صنفِ لطیف سے نفرت بھی کرنے لگے؟ سترچوہے کھا کر؟ کیوں؟ "

پرنس جلدی سے بولے۔" اور آپ کا اخلاق تو دیکھیے کہ آپ نے پوری صنف سے اظہار نفرت بھی کیا تو میری بیوی ہی کے تذکرے کے سلسلے میں۔"

نواب زادہ حمید، جو ہم سب میں حد درجہ سنجیدہ تھے، قدرے غصہ ہو کر پرنس سے بولے " خیر آپ اپنی بیوی کو تو ہر وقت اُچھالتے نہ پھریے ..... ، ہاں بھئی موسوی، سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی تمھیں عورتوں کی پوری صنف سے نفرت ہے؟ "

اُنھوں نے سنجیدگی سے جواب دیا " بالکل سچ عرض کرتا ہوں۔ یہ صنف حد درجہ قابل نفرت ہے۔"

نواب زادہ نے کہا " کوئی دلیل؟ "

وہ بولے " غور سے دیکھئے ارتقائی مدارج میں عورتوں کا درجہ

حیوانی صفوں سے کسی طرح آگے نہیں بڑھتا "

مَیں نے پھر اپنے خاص انداز میں کہا " اچھا تو میاں ڈارون ک
ارتقا، یہاں بھی موجود ہے ؟ "

موسوی زرا جھلّا کر بولے " جی ہاں ، جہاں کہیں نمو ہے، وہاں
ارتقا ہے - ہندوستان کے علاوہ دوسرے مُلکوں میں عورتیں ذی حیات
مخلوق میں داخل ہیں - اِس لئے ان میں بھی ارتقا ہے - ارتقا، ذہنی،
ارتقا جسمانی، ارتقا روحانی ! "

نواب زادہ نے کہا " ارے میاں تم بھی ولّال کی باتوں میں آگے
وہ یوں ہی چھیڑتا ہے "

میں نے نواب زادہ کی یہ بات سُن کر اپنے دفاع میں یہ کہنا ضروری
سمجھا " بڑی مشکل ہے کہ انسان جو بات نہ سمجھے وہ پوچھے بھی نہیں، میں نے
تو کیمبرج کی صورت بھی نہیں دیکھی ! میں .... "

اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ پرنس نے اپنے بڑے بڑے ہاتھوں سے میر
چھوٹا سا منھ بند کر دیا اور بولے " ہاں بھئی موسوی قابل نفرت ہونیکا ثبوت ؟

موسوی نے کہا " اسکے لئے ثبوت کی کیا ضرورت ہے، یہ تو ایک
واضح سی بات ہے، تم ہی دیکھو کہ انسان کی سب سے بڑی صفت یہی ہے کہ وہ
خود غرض نہ ہو، بلکہ بے نفس ہو - صحیح معنوں میں " بیخود " ہو - یہاں اس

پوری صنف کا خود غرضی خاص شیوہ ہے۔ بلکہ میں تو کہونگا کہ "مارکہ" ہے۔ انھیں نے ازل ہی سے اس صفت پر رجسٹری کرالی ہے، عہد سے لحد تک آرائشوں کا، زینتوں کا مدار، منبع، مرکز یہی ہیں۔ سولہ سنگار، بتیس ابٹن انھیں کے لئے ہیں۔ انھیں کی بوٹی بوٹی شقاوت کا گھر ہے۔ انھیں کے ابرو خنجر، انھیں کی آنکھیں نشتر، انھیں کے اشارے دلوں کا خون کر دینے والے۔ انھیں کے غمزے سیکڑوں کو بسمل رکھنے والے ہوتے ہیں۔ مرد غریب ایک صید محض ہے، اور یہ حد درجہ سفاک صیاد۔ اسکی حیثیت اُس مکھی کی ہے جو مکڑی کے جال کی چمکیلے ورخوبصورتی دیکھنے جائے اور اُسی میں گرفتار ہو کر رہ جائے۔ اِن شاطر عیاروں نے اس طرح کے خس پوش کنوئیں بنا رکھے ہیں کہ بڑے سے بڑا چالاک و ہوشیار مرد بھی گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

موسوی کی تقریر کے جوش نے ہم سب لوگوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ سانس لینے کے لئے رُکے ہی تھے کہ پرنس بولے "ماشاء اللہ میرے ڈیمی ماستھینز، ماشاء اللہ! فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ لیکن یہ نہ سوجھی کہ یہ ساری باتیں یورپ کے لئے ہیں۔ جہاں کا تھیں تجربہ ہے یہاں ہندوستان میں ان باتوں کا وجود نہیں۔ میری بیوی ہی کو لے لو....."

ہم سب اس پر کچھ کہا چاہتے تھے کہ موسوی نے ہاتھ کے اشارے سے روک کر کہا "بھئی پہلے پوری بات سُن لو، پھر اعتراض یا مخالفت کرنا.....

غور سے دیکھو، انصاف کرو۔ لڑکی پیدا ہوئی، ابھی مشکل تُتلی زبان میں بولنے پائی ہوگی کہ اسکی نمائش شروع ہوگئی، لڑکوں کے لئے ایک کُرتہ، اسکے لئے تین تین کپڑے۔ زرا اور بڑھی اور کان ناک چھدے اور سونے چاندی کے زیورات پور پور میں دکھائی دینے لگے۔ ابھی جوان بھی نہ ہونے پائی تھی کہ نسبتوں کی تلاش کی فکر دامنگیر ہوگئی۔ خیر خدا خدا کر کے بات پکی پڑھی ہوئی تو برات بیاہ کی ٹھہری۔ اِس میں کم از کم اتنا خرچ کرنا پڑا کہ جتنے میں چار لڑکوں کی شادیاں ہو جائیں۔ اب چوتھی چالے کا سلسلہ چلا۔ باپ غریب بک جائے بھیک مانگے، لیکن یہ سب پورا کرے۔ اچھا صاحب باپ کو مفلس، قلاش بنا کر میاں کے گھر آئیں، یہاں پہونچتے ہی پاؤں پھیلا دئے۔ میرے لئے دوسرا گھر بناؤ۔ میں ان ساس، نندوں کے ساتھ ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتی۔ وہ مجھے کوس کوس کر کھا جائینگی۔ لیجیے صاحب ماں، باپ، بہن، بھائی، سب کو چھوڑ کر علیحدہ گھر بنا۔ اب آرائش و زینت کا سامان مہیا کرو۔ یہ بھی ہوا۔ امید ہوئی کہ اب شاید چین ملے۔ جی نہیں طبیعت ناساز ہوگئی۔ حکیم، ڈاکٹر بلواؤ۔ نو مہینے ایک حد درجہ بدنما صورت دیکھکر آنکھوں کے دُکھنے کی شکایت نہ کرو، بلکہ ظالموں کو یہی یقین دلائے جاؤ کہ "تم اب پہلے سے بھی اچھی معلوم ہوتی ہو۔" غرض کسی طرح صاحبزادے بھی بنے۔ اب کیا تھا پوری قیامت آگئی۔ دائیاں، کھلائیاں، دودھ پلائیاں اور نہ معلوم کتنی "آئیاں، جائیاں" ضروری ہوگئیں۔ "وہ"

پلنگ پر لیٹی رہیں، چوزے کھائیں، سیروں گھی پی جائیں، منوں مقویات اُڑا جائیں۔ تم دبے پاؤں آؤ اور دبے پاؤں چلے جاؤ۔ اگر مرد غریب ان آلام اور مصائب کو نہ برداشت کر سکا اور بیوی کی خوش قسمتی سے مر گیا۔ تو پھر کیا پانچوں گھی میں ہیں۔"

مَیں نے کہا "اب تو مبالغہ و مغالطہ دونوں اپنی حدوں سے بھی گزر چکے۔"

موسوی بولے "نہیں حضت یہ بات نہیں مَیں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بیان واقعہ ہے۔ دیکھیے نا۔ ہیں تو بیوہ، شوہر نے ٹکا نہیں چھوڑا، کوئی ذریعہ معاش نہیں، لیکن بیوی صاحبہ ہیں کہ اب سوائے سیاہ کے دوسرے رنگ کا کپڑا ہی نہیں پہن سکتی ہیں۔ شوہر نے زندگی میں جتنے کپڑے بنائے وہ سب بلا تفرقہ، لیکن انکی بیوگی کے اظہار کے لئے نئے نئے جوڑے ضرور تیار ہوں۔ بغیر ان کے رونے میں مزہ ہی نہیں آتا۔ زرد زرد چہرے اور سُرخ سُرخ آنکھوں پر سیاہ ہی پھبتا ہے۔ دوسرے رنگ کے کپڑے پہن کر نہ تو آنسو نکل سکتے ہیں اور نہ دردِ دل کا اظہار ہو سکتا ہے! کیوں صاحب، جھوٹ ہے؟ دلاّل صاحب آپ ہی فرمائیے؟"

میں نے کہا "واللہ تمھیں مغالطہ دینا اور تصویر کا ایک رُخ دکھانا خوب ہی آتا ہے۔"

موسوی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں بھئی تم ایسا کیوں نہ کہو گے۔ تم نے بھی تو اسی سمیم آب و ہوا میں تربیت پائی ہے! پھر کہتا ہوں، سچ مانو! یہ پوری صنف، بڑی ذات شریف ہے۔ جب انکا جی چاہا تمہیں اُنھوں نے بُرا بھلا کہہ لیا! ان کا جواب دینا تمھارے لئے غیر شریفانہ ہے۔ عورت کے مُنہ کون لگے؟ اتنا ہی نہیں، بلکہ جب اُنکی خوشی کرو تو خود اپنی نظروں میں اپنی وقعت گھٹتی ہے، خودداری کو تکلیف ہوتی ہے اور قوت ارادی کمزور ہوتی ہے۔ جب وہ تمھاری خوشی کرینگی، تو محض کسی غرض سے، تم خوش ہوئے اور اُنھوں نے ایک فرمائش رسید کی۔ "ہمارے لئے موتیوں کا ہار خرید دو۔ اون اون! فلاں کے پاس بڑا اچھا ٹیکہ ہے ویسا ہی ہمارے لئے بنوا دو۔ اوں اوں......" کیا کیا بتاؤں۔ اگر اِنھیں پردہ میں رکھو تو بیمار ہو کر گھلنے لگیں گی دق وسل میں مبتلا ہو جائینگی......"

مَیں نے کہا "یہ بھی کوئی اختیاری امر ہے"

وہ بولے "میٹھی میٹھی پلنگ کے بانده توڑینگی، خود اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرینگی، غذا میں حد درجہ بد پرہیزی برتیں گی۔ پھر بیمار نہ ہونگی تو کیا اچھی رہیں گی؟"

نواب زادہ نے اُکتا کر کہا "اچھا بھئی، اچھا، یہ سب صحیح، پردہ میں رکھو تو یہ کرتی ہیں کہ بیمار ہو جاتی ہیں اور اگر پردہ میں نہ رکھو تو؟"

اُنھوں نے کہا "اگر پردہ سے باہر نکالا تو باپ دادا، خاندان، ملک، تربیت، تعلیم، کسی امر کا پاس نہ کرینگی۔ مَردوں کا بیدھڑک منظرِ عام پر شکار کرینگی، غرض ہر طرح آفت، ہر نہج سے بَلا ہیں!"

میں نے چپکے سے پوچھا "تو پھر آپ کے نزدیک یہ صنف کسی طرح کے مَراعات کی مستحق نہیں؟"

وہ نہایت جوش سے بولے "ہرگز نہیں۔ اُنکی جس بات پر، جس نہج سے، جس پہلو سے، غور کیجیے، وہ خود غرضی اور محض خود غرضی پر مبنی نکلیگی۔ میری تو دعا ہے کہ خدا ہر شریف و رذیل کو اُنکے مکروں سے بچائے!"

ہم لوگ جب اُس دن پہاڑ سے پلٹے تو ہوٹل میں داخل ہوتے وقت مینیجر نے موسوی کو ایک خط دیا۔ وہ اسی طرح بحث میں مشغول خط ہاتھ میں لئے کمرہ تک پہونچے۔ وہاں پرنس نے ٹوک کر کہا "مردِ خدا خط تو پڑھ لو پھر بحث کرتے رہنا"

اُنھوں نے اُنکے ٹوکنے پر چونک کر لفافے پر نظر ڈالی، اور یہ کہکر کہ "ارے یہ تو والد کا خط ہے" لفافہ چاک کیا اور جلد جلد پڑھنے لگے۔ ہم لوگ بھی اُنھیں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اِس لئے کہ اُن دنوں اُنکی والدہ سخت علیل تھیں خیال تھا کہ شاید اس خط سے انکی کچھ خیریت معلوم ہو۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ خط پڑھتے پڑھتے موسوی کا چہرہ دفعتًا بالکل زرد ہو گیا۔ ہم لوگوں کا دل دھڑکنے لگا کہ

خدا ہی خیر کرے۔ ہم اُن سے سبب پوچھا ہی چاہتے تھے کہ پھر اُن کا چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا۔ ابکی پرنس سے نہ رہا گیا وہ انکے عزیز بھی تھے، اِس لئے اُنھیں ہم لوگوں سے زیادہ حق بھی تھا۔ وہ خط پر ہاتھ ڈال کر بولے "کیوں خیریت تو ہے" کیا لکھا ہے کہ تم گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے ہو؟

موسوی کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اور وہ خط اُنھیں دے کر بولے "جی لیجیے، آپ خود ہی ملاحظہ فرما لیجیے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ۔ من درچہ خیالیم فلک درچہ خیال!"

پرنس نے جلدی جلدی خط پڑھا اور بولے "جی نہیں، آپ نے مصرع پڑھنے میں غلطی کی۔ ہونا یوں چاہیے۔ "من درچہ خیالیم و پدر درچہ خیال!"

یہ کہہ کر اُنھوں نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے۔ یہاں موسوی بڑے چراغ پا ہوئے۔ بولے "جی ہاں، تمھیں ہنسی سُوجھتی ہے۔ ایک انسان کی زندگی کی بربادی تمھارے لئے دل لگی ہے۔ بڑا اچھا مذاق ہے کہ تم ہنسی سے بیتاب ہو۔ لطف یہ کہ یہ جتنا بگڑتے تھے اتنی ہی اُنکی ہنسی بڑھتی جاتی تھی۔

بالآخر نواب زادہ نے، جو تمام عالم کی سنجیدگی کے ٹھیکہ دار ہیں، گھبرا کر پوچھا "ارے بھئی آخر اس خط میں کیا لکھا ہے کہ تم جس قدر اظہار غم و غصہ کر رہے ہو، پرنس اُسیقدر ہنس رہے ہیں؟ کچھ ہم لوگوں کو بھی بتاؤ!"

موسوی جھلا کر بولے "لکھا کیا ہے۔ میرے والد صاحب نے میری قسمت کے فیصلہ کی ٹھہرائی ہے، اور میری شادی احمد نبی سیٹھ کی لڑکی سے

طے فرمادی!"

پرنس نے زرا ہنسی روک کر کہا "اور مزہ یہ کہ میں ان صاحبزادی کے خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ میری بہن کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ انکو مردوں سے اسی قدر نفرت ہے جتنی کہ انھیں عورتوں سے! خیر خوب گزریگی..."

اور پھر مردک ہنسنے لگا۔

میں نے موسوی کے بڑھتے ہوئے غصے کو فرو کرنے کے لئے کہا "تو آخر اس میں اس قدر غم و غصہ کی کیا بات ہے؟ اگر تھیں نا منظور ہو تو انکار کردو۔"

نواب زادہ پرانے ریت رسم کے پابند، بھلا ایسی بات کہاں سن سکتے تھے، مجھے بڑے زور سے ڈانٹ کر بولے "کاظم تم بھی بعض وقت پکے سودائیوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا شرفا میں بھی کہیں یہ ہوتا ہے کہ والدین شادی طے کردیں اور لڑکا انکار کردے۔ توبہ! توبہ! کتنی معیوب بات ہے!"

میں نے کہا "جی ہاں بیحد۔ اس لئے کہ انکی جگہ ان کے والدین ہی تو اس لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرینگے۔ جو صاحب معاملہ ہے وہ تو عورت کے نام سے متنفر ہے، اور بڑے میاں ہیں کہ زبردستی گلے منڈھے دیتے ہیں۔ بس یہ گردن جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ اور سب کو دل ہی دل میں کوسا کریں یہی شرفا کا دستور ہے اور یہی سب سے اچھا طریقہ ہے!"

پرنس نے کہا "تو اسکے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے ہیں؟ اگر انکار کردیں

تو ان کے والد عاق ہی کر دیں۔ زندگی بھر ان کا منہ نہ دیکھیں۔ یہ لاکھوں روپیہ کی دولت ادھر ہاتھ سے جائے اُدھر وہ سیٹھ کی ایک ہی لڑکی ہے اور صرف پچاس لاکھ اسکے نام سے بنک میں جمع ہیں۔"

موسوی زرا اکڑ کر بولے "مجھے نہ والد کے روپیوں کی ضرورت ہے اور نہ سیٹھ جی کے! اُن لوگوں کو اپنی دولت مبارک رہے۔ میں نے اتنا پڑھ لکھ لیا ہے کہ میں اپنی قوت بازو سے اپنے کھانے بھر کو پیدا کر سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کسی کا محتاج نہیں!"

نواب زادہ نے، جو ہمیشہ اُلجھی ہوئی بات کو سُلجھانے اور بڑھتے ہوئے غصّے کو ٹھنڈا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے، پرنس کو ایک جانب لے جا کر کچھ آہستہ آہستہ باتیں کیں۔ پھر موسوی کے پاس پلٹ کر آئے اور اُن سے کہا "اچھا زرا ہاتھ مُنہ دھو لو۔ کچھ کھا پی لیں تو پھر اس مسئلہ پر غور کیا جائے۔"

موسوی نے کہا "اس میں تم لوگوں کے غور کی ضرورت ہے؟ میں اپنا بُرا بھلا خود سمجھتا ہوں اور میں نے فیصلہ کر لیا۔"

نواب زادہ انھیں حمام کی طرف ڈھکیل کر بولے "اچھا تو تم پہلے مُنہ ہاتھ دھو آؤ اسکے بعد ہم لوگ تمھارا فیصلہ سُنیں گے۔"

جب وہ حمام میں چلے گئے تو نواب زادہ میری طرف پلٹے اور مجھے دھمکانے کے لئے گھونسا تان کر بولے "کاظم اگر تم نے زرا بھی میری مخالفت کی، تو میں

تمھاری یہ پھولی پھولی ناک مارے گھونسوں کے بالکل چپٹی کر دونگا۔"

میں خوف زدہ انداز سے ذرا پیچھے ہٹا۔ تو وہ تھوڑا سا مسکرا کر بولے "ذرا سنجیدگی سے کام لو۔ بھلا موسوی کے لئے اِس سے بہتر اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ، ایرانی نژاد، اور ایک بھلے گھر کی، پھر لاکھوں روپے کی مالکہ۔ اب کیا آسمان سے کوئی تارہ ٹوٹ کر آئے گا، یا میاں موسوی کے لئے زہرہ مشتری آجائیگی؟"

مَیں نے دبی زبان سے کہا "بھئی مجھے تو اصولی اختلاف ہے میں تو عقلاً والدین کو یہ حق دینا ہی نہیں چاہتا کہ وہ جہاں اُن کا جی چاہے بیٹے بیٹیوں کا گلا پھانس دیں، آخر اُنھیں اِسکا کیا حق ہے؟"

نواب زادہ نے کہا "میں اِس وقت تم سے بحث کرنے کے لئے تیار نہیں اور نہ مجھے تمھارے ناممکن العمل نظریوں کی ضرورت ہے لیکن میں تم سے پھر صاف صاف کہے دیتا ہوں۔ کہ اگر تم میری اور پرنس کی اس معاملے میں تائید نہیں کر سکتے ہو تو چپکے ہی بیٹھے رہو۔ دیکھو مخالفت نہ کرنا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔"

مَیں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا "بہت خوب سرکار۔ حضور کے گھونسوں کے ڈر سے منظور کیے لیتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ آپ حضرات چند زرد سپید سکوں کے لئے دو زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔"

پرنس ترشرو ہو کر جھڑک کر بولے "دو زندگیوں کی احتمالی بربادی کو تو

آپ بے حد اہمیت دے رہے ہیں۔ لیکن چار بوڑھے بوڑھیوں کی یقینی موت کا خیال ہی نہیں کرتے!"

میں نے بھی پرنس کے لب و لہجہ سے اثر لیکر زرا سختی سے جواب دینا چاہا تو نواب زادہ نے مجھے روک کر کہا "ارے یار کاظم، زرا خط تو پڑھ لو، دیکھو موسوی کے والد نے کن الفاظ میں لکھا ہے، سنو۔ لکھتے ہیں۔ "میاں میں تمھاری آزاد خیالی سے واقف ہوں۔ لیکن تمھاری ماں بستر مرگ پر ہیں۔ میں خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ ہم دونوں کی اُمیدیں اور خوشیاں صرف تمھاری ذات سے وابستہ ہیں۔ سیٹھ کی لڑکی کو میں نے گود میں کھلایا ہے سیٹھ میرے منھ بولے بھائی ہیں اور ساری عمر کے دوست۔ میں ان کے گھر کے چلن سے واقف ہوں۔ وہ میرے گھر کے طور طریقے سے آگاہ ہیں۔ خدارا کہیں ایسا نہ کرنا کہ جلد بازی سے کام لے کر انکار کر بیٹھو۔ اِس لئے کہ اس سے ہم بوڑھوں کے دل پر اتنا کاری زخم لگے گا کہ اس کا اندمال محال ہو جائیگا۔" اب تمھیں بتاؤ کہ اسکے بعد کیا فیصلہ کرتے ہو؟"

میں نے کہا "سچ پوچھو تو یہ بڑے میاں کی خود غرضی ہے، اپنی زرا سی خوشی کے لئے بیٹے کی ساری زندگی برباد کرنے کے لئے تیار....."

میں ابھی جملہ تمام بھی نہ کرنے پایا تھا کہ موسوی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نواب زادہ کی خاطر سے ساکت ہو رہا۔

کھانے پر اور اس کے بعد قریب قریب تمام شب نواب زادہ پرنس اور موسوی سے اس معاملے پر ہر حیثیت اور پہلو سے بحث ہوتی رہی۔ میں چپکا سنا کیا۔ نہ میں نے موسوی سے اس رشتہ کے منظور کرنے پر اصرار کیا اور نہ انھیں انکار کرنے کی ترغیب دی، بلکہ میں حد درجہ استقلال سے بیٹھا اس تماشہ کو دیکھا کیا لیکن پھر بھی صبر کہاں تک؟ اور وہ بھی جب کہ موضوع بحث ایک ہی ہو، اس لئے میں نے کوئی دو بجے کے قریب عاجز آکر موسوی سے کہا "ارے میاں خدا کے لئے اب کسی امر کا قطعی فیصلہ کر لو۔ ساری رات گزر گئی اور یہ بات ہی نہیں طے پاتی۔ میری دانست میں تو تم کو یہ شادی محض اس لئے کر لینا چاہیئے کہ اس میں تمھارے نظریہ کے اثبات کے ہر طرح امکانات موجود ہیں۔ تم عورتوں سے متنفر اور مس صاحبہ مردوں سے۔ نام کی شادی ہو گی۔ نہ تم اُن کے میاں، نہ وہ تمھاری بیوی، نہ تمھیں اُن سے مطلب، نہ انھیں تم سے کوئی سروکار۔ جب انسان کو اس طرح کی بیوی ملے اور اسی کے ساتھ کئی لاکھ روپے، تو اسکی خوش قسمتی کی کوئی حد ہی نہیں! ایسی حالت میں انکار کفرانِ نعمت ہے، کفرانِ نعمت!"

پرنس، نواب زادہ، اور انکی دیکھا دیکھی موسوی، تینوں مجھ پر پل پڑے، اور اتنے تکیوں، لحافوں، کمبلوں اور چادروں کی مجھ پر بارش ہو گئی کہ میں تو انکے نیچے دب کر سو ہی گیا۔ اور یہ سب نہ معلوم کب تک بحث کیا کئے!"

کلکتہ پلٹنے پر میں اپنے پیٹ کے "دھندے" میں اس طرح مشغول ہو گیا کہ اِن احباب سے بالکل مِل ہی نہ سکا۔ کوئی دو ہفتہ بعد ایک روز پرنس میرے جھونپڑے پر پانچ بجے شام کے قریب آئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "ارے بھائی دلآل، تم تو اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ!"

میں نے کہا "جی میں نہ تو پوتڑوں کا رئیس ہوں اور نہ باپ دادا نے مزدوروں کا گلا کاٹ کر اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ ساری عمر کھاتا اور لُٹاتا پھروں اور پھر بھی کم نہ ہو۔ میں تو ایک غریب مزدور ہوں۔ دن بھر محنت کرتا ہوں تو کہیں چار پیسے مِل جاتے ہیں۔"

وہ ہنس کر بولے "اچھا بھئی، ہم پوتڑوں کے رئیس اور تم پشتہا پشت کے مفلس! مگر تم نے یہ بھی سُنا کہ موسوی کی شادی آخر ہم لوگوں نے طے کرا ہی دی؟ اِن صاحبزادے کو آخر راضی ہونا ہی پڑا۔"

میں نے کہا "خوب! لیکن صنف نازک کے متعلق انکے نظریوں کا کیا حشر ہوا؟"

پرنس نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا پھر وہ بولے "تم بھی کہاں کی باتیں کر رہے ہو۔ ہندوستان میں کہیں ایسے نظریے ورزیے چلتے ہیں! سب یوں ہی بکا کرتے ہیں لیکن جہاں معاشرتی پھندوں میں پھنسے سب بھول جاتے ہیں۔"

مَیں نے کہا "تو میاں موسوی کی باتیں بھی زبانی ہی تھیں، وہی یورپ کے

غیر منہضم خیالات ؛ "

پرنس نے متانت سے جواب دیا "نہیں صاحبزادے تو اب تک نئے گرفتار جنگلی جانور کی طرح " فوں، فاں " کر لیتے ہیں۔ لیکن یارانِ طریقت کب سنتے ہیں۔ انکی اتنی جرأت نہیں، کہ باپ کے سامنے صاف صاف کچھ کہہ سکیں اگر پسِ پشت مجھ سے کچھ کہا بھی تو میں مذاق میں ٹال دیتا ہوں۔ وہ لاکھ کوشش کریں، پھندا مضبوط ہے۔ وہ چھوٹ نہیں سکتے!"

میں نے کہا "تو اگر انھیں کے ہاں چلتے ہو، تو میں بھی تمھارا ساتھ دوں۔ تعزیت کے فرائض ادا کرنے ہیں۔ اِس سے جس قدر جلد سبکدوشی حاصل ہو اتنا ہی اچھا۔"

وہ اس پر بہت ہنسے، پھر کہنے لگے "نہیں وہاں سے بہتر جگہ تمھیں لے چلنے کا ارادہ ہے۔ سیٹھ نے آج پورے "طائفہ دزدانِ عرب" کو ڈنر دیا ہے۔ چونکہ تمھارا پتہ وہ نہ جانتے تھے، اس لیے تمھارا خط بھی میرے ہی پاس انھوں نے بھیجدیا ہے، یہ دیکھو میری جیب میں ہے۔"

میں نے دیکھا تو واقعی سیٹھ نے پتہ نہ جاننے کی معذرت کی تھی اور مجھے سات بجے کھانے پر بلایا تھا۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور پرنس کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر سیٹھ کی کوٹھی پر پہونچا۔ اتفاق یہ کہ ہمارے موٹر کے رکتے ہی نواب زادہ اور موسیو دوسری موٹر سے اُترتے دکھائی دیے۔ آپس میں

مصافحہ کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم پہنچے۔

ہر میز پر سگار، سگریٹ، الائچی، پان وغیرہ رکھے تھے۔ کمرے بھر میں بجلی کی روشنی تھی۔ اور کمرے کی سنہری منقش دیواریں عجیب خوشنمائی سے چمک رہی تھیں۔ سیٹھ سے ہم لوگوں سے پہلے ہی سے تعارف تھا۔ وہ ایک پچاس پچپن برس کے دراز قد آدمی تھے۔ ہم لوگوں سے انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا، اور رسمی مزاج پرسی کی۔ میں نے دیکھا کہ اُس روز اُن کے چہرے سے دو طرح کے جذبات نمایاں تھے۔ ایک تو خوشی کے، دوسرے شرمندگی کے۔ خوشی غالباً موسوی کو فرزندی میں لینے کی تھی۔ البتہ شرمندگی کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آتی تھی۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ اُنھوں نے نواب زادہ کو مخاطب کر کے کہا "میری بیٹی زینت اور علی کبیر موسوی کے درمیان جس رشتہ کا تذکرہ ہوا ہے، اُسکا حال آپ لوگوں کو معلوم ہی ہے۔ چونکہ آپ حضرات انکے اعزا و احباب خاص ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ میں آج ایک اہم معاشرتی اصلاح کو بیان کردوں، جسکا میں پابند ہوں۔ میرا خیال ہے، اور زینت میرے اس خیال کی سختی سے پابند ہے۔ کہ پردہ بدترین شے ہے اور ہمیں اس مذموم رسم کے جلد سے جلد اُٹھا دینے کی کوشش کرنا چاہیے!"

نواب زادہ، پُرانے خیال کے آدمی، وہ ذرا گھبرائے، میں چپکا مُسکرایا۔ پرنس ناسمجھی سے ہنس پڑے۔ سیٹھ انکی طرف متوجہ ہوکر بولے "کیوں صاحب!

کیا آپ کو اس سے اختلاف ہے ؟"

وہ چُپ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے۔ نواب زادہ نے بگڑتی ہوئی بات بنائی اور نہایت متانت سے سیٹھ سے کہا "آپ کے خیالات سے اختلاف یا اتفاق موجودہ صورت میں، دو ہی شخصوں کا قابل التفات ہے۔ اول تو موسوی کا، دوسرے اُن کے والد کا۔ اگر ان حضرات کو آپ سے اتفاق ہے تو ہمارا اختلاف یا اتفاق کوئی وزن نہیں رکھتا ہے۔"

سیٹھ مسکرا کر بولے "میں نے ان کے والد سے گفتگو کر لی ہے۔ وہ میرے ہمخیال تو نہیں ہیں، لیکن میرے مخالف بھی نہیں ہیں۔ اب رہے میاں علی کبیر، تو اُنکی رائے سے مجھ سے زیادہ آپ لوگ واقف ہونگے۔

میں نے نواب زادہ کے کان میں جُھک کر کہا "اگر پردہ سے باہر نکالو تو ہر شخص کے ساتھ ....." اُنھوں نے زہر کی چٹکیوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے ایک سگریٹ جلدی سے جلائی اور کنکھیوں سے موسوی کو دیکھنے لگا۔ اس بیچارے کی عجیب حالت تھی۔ پیشانی پر عرق کے چھوٹے چھوٹے قطرے دکھائی دیے تھے۔ گھبراہٹ یہ کہ نظریہ تو یہی تھا، لیکن اگر اس وقت صاف صاف سیٹھ کی طرفداری کرتے ہیں، تو ہم لوگوں کے سامنے مس زینت بُلالی جاتی ہیں۔ ہندوستانی تربیت اور حمیت اس سے متنفر، مغربی معاشرت و فلسفہ اس پر مصر، عجیب گومگو کی حالت تھی۔ گردن جُھک گئی اور نظر فرش پر جم گئی۔

سیٹھ نے انھیں استعجاب سے دیکھا۔ انھیں خیال تھا، اور صحیح خیال تھا، کہ کیمبرج کا تعلیم یافتہ، عقل کو جھوٹی حمیت پر ترجیح دیگا۔ اور اس "معاشرتی اصلاح" میں ان کا بہت بلند آہنگی سے ساتھ دیگا۔ موسوی کے اس طرح کے سکوت نے انھیں بالآخر متوحش کر دیا اور انھوں نے گھبرا کر پوچھا "کیوں میلس، کیا تم میرے ہمخیال نہیں ہو؟"

پرنس نے آہستہ سے موسوی کا زانو دبایا۔ انھوں نے سر اٹھا کر کہا "جی نہیں۔ مجھے آپ کی رائے سے اختلاف نہیں....."

سیٹھ مسکرائے اور بولے "الحمد للہ۔ تو میں زینت کو ابھی لے آتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ادھر نواب زادہ کی برہمی شروع ہوئی "لاحول ولاقوۃ۔ یہ تم لوگوں کے سر میں نہ معلوم کیا سمائی ہے۔ توبہ، توبہ۔ نہ شرافت کا خیال، نہ شرع کا پاس!"

پرنس نے متین بن کر کہا "حضور بقصد نکاح غیر محارم پر نظر ڈالنا جائز ہے۔"

نواب زادہ بولے "تو بھئی اُنکے لئے نا، ہم لوگ کیا آنکھیں بند کر لینگے؟"

میں نے اپنے منجھے ہوئے لب و لہجہ میں کہا۔ "نہیں ہم لوگ بقصد بھابی بنانے کے دیکھیں گے۔"

موسوی نے اِس پر ایک مخملی تکیہ جو وہیں کوچ پر رکھا تھا کھینچ مارا۔

میں نے کہا "اچھا میں سمجھا۔ یہ مجھے میرے فرض کی یاد دہانی ہے۔"

میں آپ کی خدمت میں باقاعدہ طور پر دلی تعزیت پیش کرتا ہوں۔"

اس پر موسوی، نواب زادہ اور پرنس تینوں نے مجھے ایک ساتھ آیا لیکن گھونسا اس زور کا رسید کیا کہ میرے منھ سے "دوہائی ہے زینت بی بی کی" بے ساختہ نکل گیا۔ معاً کواڑ کھلے اور سیٹھ صاحب مع اپنی بیٹی کے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ یہ خیال کر کے کہ میری چیخ باپ بیٹی نے کہیں نہ سُن لی ہو، میں بالکل جھیپ گیا۔ اور میں نے گردن جھکا لی۔ نواب زادہ نے اپنے جذبات پر قابو پانے کے لئے ذرا سا مُنھ پھیر لیا۔ لیکن پرنس اور موسوی دونوں ٹکٹکی باندھے دیکھا کیئے۔ جب یہ لوگ قریب آ گئے تو میں نے اوپر نظر اُٹھائی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ایک بقعۂ نور میرے سامنے ہے۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نوری مجسمہ سے مبہوت کیفیت کے ساتھ تعارف کے بعد ہاتھ ملایا۔

مجھے نہیں یاد کہ میں نے اس شب کی کئی گھنٹہ کی صحبت میں زینت سے کیا باتیں کیں، یا نواب زادہ اور پرنس نے کیا کہا۔ موسوی البتہ میری نظر میں قابلِ رشک تھے اور اس لئے میں اُنکے افعال و حرکات بغور دیکھتا رہا۔ وہ انکا شرمانا، وہ انکا جھلانا، وہ انکی آنکھوں کی مسکراہٹ، وہ ان کی نظروں کی لگاوٹ، وہ انکی زینت سے رُکی رُکی باتیں مجھے سب یاد ہیں۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا کہ زینت نے موسوی سے سب سے کم باتیں کیں اور مجھ سے سب سے زیادہ۔ اور جب ہم لوگ رخصت ہونے کے لئے

اُٹھے تو ہاتھ ملاتے وقت مجھ سے بولیں "میں آپ سے مل کر بیحد خوش ہوئی
پھر ضرور ملیے گا۔"

ممکن ہے کہ یہی فقرہ زینت نے پرنس یا نواب زادہ سے بھی کہا ہو۔
لیکن میرے لیے اس فقرے میں ایک عجیب طرح کا اثر بھرا تھا، جس نے
میرے دل میں انواع و اقسام کے جذبات برانگیختہ کر دیئے، وہی فقرہ جو
دوسروں کے مُنھ سے روکھا، پھیکا، سیٹھا، محض اخلاق معلوم ہوتا، اُنکے
مُنھ سے خاص التفات اور مخصوص عنایتوں کا مجموعہ بن گیا۔ صرف ان چند
الفاظ کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں تین شبانہ روز انھیں کے خیال میں غرق رہا۔ دل
قابو سے باہر تھا، دماغ اس طرح جل گیا تھا گویا واقعی پری کا سایہ ہو گیا ہو۔

چوتھے دن اِس انوکھی کیفیت سے عاجز آکر میں نے ایک بہانہ
نکالا اور سیٹھ کے گھر پہونچا۔ وہ تو جیسا مجھے یقین تھا اپنے دفتر میں تھے،
البتہ مس صاحبہ موجود تھیں۔ اطلاع کرائی، تشریف لائیں اور تپاک سے ملیں،
میں گھبرایا گھبرایا ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُٹھنے لگا تو
اُنھوں نے اصرار سے پھر بٹھایا۔ میں اپنی خوش قسمتی پر دل ہی دل میں خوش
ہو رہا تھا کہ موسوی مع پرنس کے آ گئے۔

مَیں اسکا مقر ہوں کہ میں نے اُس وقت موسوی کو بالکل ویسی ہی
تیکھی چتونوں سے دیکھا جن سے وہ مجھے گھور رہے تھے۔ پرنس البتہ مجھے دیکھ کر

مسکرائے اور بولے " اخاہ بھئی ولاؔل۔ تم یہاں کہاں۔ یہ تو تمھارے کام کے اوقات ہیں ؟"

میں نے کہنے کو تو کہہ دیا کہ "کام ہی سے آیا تھا" لیکن اُس ظالم کے دوبارہ مسکرا دینے پر دل میں کٹ کٹ گیا۔

اسی شرمندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ میں پھر اُٹھ کر چلا۔ اب کی پھر زینت نے پہلے سے بھی زیادہ اصرار کے ساتھ بٹھایا۔ میں نے دیکھا کہ موسوی کو یہ تپاک ناگوار گزرا۔ لیکن پرنس نے مسکرا کر زینت ہی کی ہاں میں ہاں ملائی اور مجھے بیٹھ جانا پڑا۔ جب چند منٹ بعد موسوی چلنے کے لیے اُٹھے تو زینت یک گونہ بے رخی سے پیش آئیں اور بولیں کیوں، کیا تشریف لے جائیے گا ؟ پھر پرنس کی طرف مڑ کر بولیں " اور آپ بھی ؟ "

اُنھوں نے شرارت سے مسکرا کر جواب دیا " ہاں۔ جی تو نہیں چاہتا لیکن میں تو ان کے ساتھ بندھا ہوا ہوں۔ آج کل، انکی شاہی ہے نا ! "

اس پر زرا وہ شرمائیں، لیکن فوراً میری طرف متوجہ ہو گئیں، مجھے اس التفات نے کسی طرح اُٹھنے نہ دیا۔ اور اس طرح جم کر بیٹھا کہ گو پرنس چٹکیاں لیتے رہے، لیکن میں نے جنبش نہ کی۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو زینت تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہیں، پھر بولیں " میرے سر میں نہ معلوم درد کیوں دفعتاً ہونے لگا۔"

میں یہ کہتا ہوا کرسی سے اٹھا "دہم لوگوں کی بیکار کی باتوں کی وجہ سے! ...... ذرا سر پر اڈی کلون لگا لیجئے اور آرام فرمائیے" ابکی جو چلا تو زینت نے روکا تو نہیں، لیکن پھر ملنے کا وعدہ مجھ سے لے لیا۔ اور دروازہ تک مجھے رخصت کر گئیں۔

غرض مختلف بہانوں اور موقعوں سے میں زینت سے پندرہ دن کے اندر کوئی دس بار ملا، اور ہر بار ملنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا، جیسے میری گردن میں پڑا ہوا پھندا اور مضبوط ہوتا جاتا ہے لیکن میں بجائے اسکے کہ اس کشش اور اس آگ سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرتا، پروانہ وار قریب ہوتا جا رہا تھا اور اس پر خوش بھی تھا کہ یوں قریب قریب تر ہوتا جا رہا ہوں۔ شاید نظام قدرت وفطرت یونہی ہے۔ ورنہ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ کون مفت میں جل کر جان دیتا اور کون قید قابل قبول کرتا ہے۔

ایک روز جب کہ موسوی کی شادی کو صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا، میں چورنگی اپنے موٹر پر ایک کام سے گیا، اتفاق کہیئے یا خوبی قسمت بس زینت "وھائٹ وے" کی دکان سے تنہا نکلتے دکھائی دیں۔ میں نے موٹر روک کر صاحب سلامت کے بعد پوچھا "کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے؟ چلئے میں پہونچا دوں۔"

وہ بولیں "کہیں نہیں۔ دم الجھ رہا تھا تفریح کرنے نکلی ہوں۔"

میں نے موٹر سے اتر کر دروازہ کھول کہا "پھر تشریف لائیے گھما لاؤں۔" وہ خاموشی سے موٹر میں میرے ساتھ بیٹھ لیں۔ میں نے گاڑی وکٹوریہ میموریل کی طرف موڑ دی۔ ہندوستان میں انگریزوں نے جتنی عمارتیں بنائی ہیں ان میں اس سے زیادہ نہ کوئی اچھی ہے، اور نہ کسی میں تفریح کے لئے اتنے ساماں ہیں۔ لیکن مس زینت نے اُس دن تو تصویریں دیکھیں اور نہ عجائب خانہ۔ بلکہ گاڑی سے اتر کر سیدھی پشت کے حصے پر چلی گئیں اور وہیں سنگ مرمر کے فرش پر بیٹھ کر اپنے خیالات میں محو ہو گئیں۔

میں تھوڑی دیر تو بیٹھا انھیں دیکھا کیا، پھر ان کی افسردگی سے متاثر ہو کر پوچھ بیٹھا کہ "خیریت تو ہے آج یہ آپ پریشان سی کیوں ہیں؟"

میرے سوال پر وہ چونک کر بولیں "جی کچھ نہیں! آج پرنس کی بیوی کے پاس گئی تھی، اُن سے دورانِ گفتگو میں آپ کے دوست کے متعلق کچھ ایسی باتیں معلوم ہوئیں، جن سے میں اس فکر میں مبتلا ہو گئی کہ والد کا اس شادی پر اصرار کوئی معقول بات بھی ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا "اگر آپ مجھے قابل اعتبار سمجھتی ہوں تو مجھے بھی وہ باتیں بتا دیجیے، شاید میں آپ کے فیصلے میں کوئی مدد دے سکوں۔"

مس زینت بلا پس و پیش کئے بولیں "وہ کہتی تھیں کہ مسٹر سوسی کو

عورتوں سے بڑی نفرت ہے۔ اور سارے جہان کی عورتوں کو بُرا سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اگر ایسا ہی ہے تو اُنھوں نے شادی کیوں منظور کرلی؟"

میں نے دل پر جبر کر کے موسوی کے متعلق کچھ نہ کہا۔ وہ اب تک میرے دوست تھے، ان کے خلاف کوئی لفظ مُنہ سے نکالنا گناہ تھا۔ اس لئے جواب کا دوسرا پہلو سوچ کر میں نے سوالیہ انداز سے کہا "آپ کے متعلق بھی تو لوگ مشہور کرتے ہیں کہ آپ کو مردوں سے نفرت ہے؟"

وہ متانت سے بولیں "ہاں شہرت تو غلط نہیں ہے میں یقینی جنسِ ذکور کو عیوب سے بھرا ہوا پاتی ہوں۔ عورتوں کے ساتھ انکے جتنے روابط و تعلقات ہوتے ہیں وہ سب خود غرضی پر مبنی ہیں۔ بچپن اور عنفوانِ شباب میں ان سے محبت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اچھے اچھے کھانے کھلاتی ہیں۔ باپ کے غصے سے بچاتی ہیں اور ہر لحظہ صدقے قربان ہوتی رہتی ہیں۔ لڑکیاں غریب دال روٹی کھالیں، لیکن صاحبزادے کے ہاں بغیر گوشت، مُچھلی، دودھ، دہی کے حلق سے نوالہ نہیں اُترتا۔ بہنیں پیوند دار کرتے، پاجامے، ساریاں پہنیں، گھر میں جھاڑو دیں، برتن دھوئیں، چولہا جھونکیں۔ بھائی صاحب اگر صاف سُتھرا کپڑا پہن کر بستہ بغل میں دبا کر اسکول تک چلے گئے تو اُنھوں نے خاندان بھر پر احسان کیا۔ گھر واپس آئے تو وہ فرعونیت، وہ تلاطم، وہ ہنگامہ ہے کہ خدا تیری پناہ! ہزاروں روپیہ باپ کا صرف کر کے کسی طرح پڑھے، جوان ہوئے،

اب عورتوں کو گھورنا، غزلیں گانا شروع کر دیا۔ دوسرے کی بہو بیٹیاں، ٹولے محلے کی لڑکیاں سب ان کا شکار ہیں۔ والدین نے عاجز آ کر شادی کر دی۔ لے لیجئے بیوی کیا آئی زر خرید کنیز آئی۔ بس اسکا فرض ہے کہ ہر وقت انکا مُنھ دیکھا کرے۔ میاں کا جو جی چاہے کریں، جو دل میں آئے بکیں۔ وہ مُنھ نہیں کھول سکتی، وہ محض انھیں کے لئے بنائی گئی ہے۔ نہ اسکے جسم میں روح ہے، نہ اسکے دل میں خواہش، یہ جو پہنا دیں پہن لے، یہ جو کھلاویں کھالے۔ نہ اپنی نیند سو سکتی ہے، نہ اپنی بھوک کھا سکتی ہے۔ اگر لڑکے پیدا کئے تو نو مہینے کی بیگار اور پیدائش کے وقت کا احتضار، کافی نہیں۔ جی اب دایہ کا بھی کام کرے، گھر کا کھانا پکائے، بچہ کو دودھ پلائے، میاں کے پاؤں دبائے اور سارے جتن کرے، پھر سیدھے مُنھ بات نہیں۔ گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتی۔ سر سبز میدانوں کی تازی ہوا کھا ہی نہیں سکتی۔ اسکول، کالج میں پڑھ ہی نہیں سکتی۔ بس گھُٹے مرے اور پرستش صنفِ مردوں کی اطاعت میں جان دے۔ مسٹر ولال میں آپ سے سچ عرض کرتی ہوں، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کی صنف نے میری صنف کی صنف کے سینے پر سوار ہو کر اسکا گلا گھونٹ رکھا ہے!"

مجھے مس زینت کی تقریر سُن کر موسوی کی تقریر یاد آ گئی۔ وہ سارا منظر، وہ موسوی کا سُرخ چہرہ، وہ نواب زادہ کا منغص ہونا، سب کچھ آنکھوں میں

پھر گیا، اور میں بیساختہ ہنس پڑا۔

مس زینت کا گلاب سا چہرہ شنجرفی ہوگیا، وہ جھلا کر بولیں "مسٹر لال یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ رونے کی بات ہے! عورتیں گل کہلاتی ہیں۔ انھیں سر پر طرّہ میں لگائیے، گلے کا ہار بنائیے۔ کوٹ میں آویزاں کیجیے۔ لیکن خدارا انھیں جوتے کے فیتے میں نہ باندھیئے۔ مردوں نے تو اس سے زیادہ اُنکی گت بنا رکھی ہے۔ وہ تو اندھے گلچینوں کی طرح اِن پھولوں کو روندتے کچلتے پھرتے ہیں!"

میری ہنسی اس صاعقہ کی چمک سے خود بخود غائب ہوگئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "تو آخر آپ نے شادی کیوں منظور کر لی؟"

وہ سر جھکا کر بولیں "صرف والد کی خاطر سے۔ میں جانتی ہوں کہ اُنھیں یہ رشتہ دل سے منظور ہے۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُن کا دل حد درجہ کمزور ہے۔ اگر میں کہیں انکار کر دوں تو اُنھیں اختلاجی دورہ ہو جائیگا۔ تمام ڈاکٹروں نے سختی سے تاکید کی ہے کہ کسی امر میں انکی مخالفت نہ کی جائے۔ اگر ذرا سا بھی پریشان ہوئے تو دورہ یقینی ہے، اور اسکے ساتھ ساتھ موت بھی! اِس لئے میں چپکی قربانی کے لئے تیار ہوں۔ لاکھوں کروڑوں قربانیاں ہو چکیں، ایک اور سہی! کسی طرح ان راکشسوں کا پیٹ تو بھرے!"

میں نے چپکے سے کہا "میں بھی مرد ہوں!"

وہ شرما گئیں۔ پیشانی پر ننھے ننھے قطرے دُرِ نایاب کی طرح جھلکنے لگے۔

پھر خجل آواز سے بولیں "معاف کیجیے گا، میں جب آپ سے باتیں کرنے لگتی ہوں تو مجھے کسی قسم کی رکاوٹ نہیں محسوس ہوتی۔ مجھے اس وقت یہ تک یاد نہیں رہا کہ میں آپ کے مُنھ پر آپ ہی کی صنف کی بُرائی کر رہی ہوں، میں بہت شرمندہ ہوں۔"

اِس شرمندگی اور رجالت نے نہ معلوم میرے دل کے ساتھ کیا قیامت ڈھائی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل کی بات یوں پوچھ لی "آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا۔ کہ آخر وہ کون سی بات ہے جسکی وجہ سے آپ مجھ سے اِس قدر صفائی سے باتیں کر لیتی ہیں؟ وہ یہ سنتے ہی چُپ ہو گئیں اور ان کے چہرے پر رنگ آگیا۔ نظریں نیچی ہو گئیں۔ جُھکی ہوئی گردن اور جُھک گئی۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا "اگر موسیٰ میرے دوست نہ ہوتے، تو میں بھی کچھ اپنی حالت کہتا!"

اُنھوں نے دزدیدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، آنکھوں سے استعجاب و خوف ٹپکا پڑتا تھا۔ لیکن ان دونوں پر سوال کی کیفیت غالب تھی۔ میں نے بھی مُنھ سے کچھ نہ کہا، صرف گردن ہلا کر ہامی بھر لی۔ ان کی نظریں اور نیچی ہو گئیں اور چہرہ زرد ہو گیا۔ میں نے اپنے کوٹ میں آویزاں پھول کاج سے نکالا اور اُس کی پتیاں نوچ کر اُن کے قدموں کے پاس ڈال دیں۔ اُنھوں نے میری صورت دیکھی، پتیوں کو دیکھا اور چاند سا چہرہ ہاتھوں سے چھپا لیا! میں نے انکی طرف سے مُنھ پھیر لیا اور کانپتے ہاتھوں سے جیب سے سگریٹ نکال کر جلائی اور پینے لگا۔ دو کش کے بعد معلوم ہوا جیسے کوئی گلا گھونٹے دیتا ہے۔ سگریٹ پھینک دی اور ٹہلتا ہوا

دوسری جانب نکل گیا۔

کوئی دس منٹ بعد جب میں اپنے جذبات پر قابو پا کر پلٹا، تو میں نے دیکھا کہ پتیاں غائب ہیں۔ اور وہ اُٹھنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ میں نے قریب جا کر پوچھا "کیا آپ واپس چلینگی۔" انھوں نے سر ہلایا۔ ہم دونوں ٹہلتے ہوئے چُپ چاپ موٹر تک آئے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ وہ اب کے میری بغل میں نہ بیٹھیں، بلکہ پچھلی سیٹ پر۔ میں انھیں اُن کے بنگلے تک لا کر پہونچا گیا۔ نہ اُنھوں نے مجھ سے اندر آنے کے لئے کہا، نہ خود مجھے موٹر سے اُترا گیا۔

گھر واپس آکر میں نے دفتر میں ٹیلیفون کر دیا کہ میری طبیعت ناساز ہے، میں نہ آؤنگا۔ اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سارا دن ٹہل ٹہل کر کاٹ دیا۔ جب ٹانگیں تھک جاتیں، پلنگ پر گر پڑتا، جب قلب کی حرکت تیز ہوتی، پھر وحشیوں کی طرح کمرے کا چکر لگانے لگتا!"

دوسرے ہی دن صبح کو میاں موسوی میرے پاس پہونچے۔ لیکن عجیب حالت سے۔ نہ سر میں کنگھا کیا گیا تھا، نہ داڑھی بنائی گئی تھی اور نہ ٹائی اور کالر درست کیا گیا تھا۔ عجیب بدحواسی اور وحشت چہرے سے عیاں تھی۔ آتے ہی صاحب سلامت کی جگہ اُنھوں نے سخت سُست کہنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے جذبات کو اُبھرنے نہ دیا۔ اور اُن سے متانت سے پوچھا "کاہے کا غصہ

اور کس بات کی خفگی ہے ؟ پہلے اسباب شکایت بیان کیجیے پھر گا لیاں دے لیجیے گا۔"

وہ دانت پیس کر بولے "کیسے بھولے بن رہے ہیں ! گویا کچھ جانتے ہی نہیں! کیوں صاحب آپ میرے دوست ہیں نا، دوست ؟"

میں نے چپکے سے عرض کیا "جی ہاں، میں آج تک اس مغالطہ میں گرفتار تو ضرور تھا۔"

وہ اور خفا ہو کر بولے "خدا کی مار تمھاری دوستی پر ! تم جانتے ہو کہ زینت سے میری پانچ ہی سات دن میں شادی ہونے والی ہے۔ لیکن تم اسے گھورتے ہو، اُس سے تخلیہ میں باتیں کرتے ہو، اور کل کئی گھنٹے تک اُسے اپنے موٹر میں لیے گھوما کیے !"

میں نے پھر متانت سے کہا، لیکن اس میں میرے مخصوص انداز کی جھلک بھی تھی۔ "تو اس میں کیا خرابی ہوئی ؟ وہ آپ کی منسوبہ ہیں اور آپ میرے دوست۔ میں انھیں سیر و تفریح کے لیے یقینی لے جا سکتا ہوں۔ آپ تو ماشاءاللہ مغربی معاشرت کے پیرو ہیں۔ اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے ؟ دوست کی منسوبہ سے تو اس طرح کا اخلاقی برتاؤ فرض ہے !"

وہ بولے "اس طرح چبا چبا کر باتیں کر رہے ہو جیسے کچھ جانتے ہی نہیں ! سارا شہر مجھ پر ہنس رہا ہے کہ بی صاحبہ ابھی سے ماشاءاللہ جب اس قدر آزاد ہیں، تو شادی کے بعد نہ معلوم کیا کیا آفت ڈھائینگی۔ اور یہ سب تمھاری ذات

سے، تمھاری وجہ سے!"

مَیں نے کہا "میں تو مرد ذات ہوں، آپ کے نظریے کے مطابق تو میرا اِس میں قصور ہی نہیں۔ اسکی ذمہ دار تو کُلیتاً مِس زینت ہیں۔ آخر مجھ بیچارے کو آپ کیوں الزام دیتے ہیں؟"

وہ اس پر حد سے زیادہ چراغ پا ہوے اور اُن کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ماریپیٹ کے لئے تیار ہیں۔ میں نے بھی لب و لہجہ بدل کر کہا "سنیے حضت۔ میں عورتوں کی صنف کو خدا کی خاص نعمتوں میں سے سمجھتا ہوں، آپ اسے حد درجہ ذلیل سمجھتے ہیں۔ مَیں مِس زینت سے محبت کرتا ہوں، اور آپ نفرت! میں نے آج تک آپ کی دوستی کا خیال کیا اور اس سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن میں اب آپ سے کہے دیتا ہوں کہ وہ آپ کی خود غرضی اور نفس پرستی کا فدیہ نہ ہوگی۔ میں اس سے اظہار عشق کرونگا اور اُسکی غلامی میں زندگی بسر کرونگا۔ مَیں اس سے اصرار کرونگا کہ وہ اپنے کو آپ کی قید بیجا سے بچائے، اور میرے گھر کو رشکِ جنت بنائے! اب آپ کا جو جی چاہے کیجیے!

موسوی نے کوٹ کے بٹن کھولے اور مجھے لال لال دیدوں سے گھورنا شروع کیا۔ حیوانیت انسانیت پر غالب آرہی تھی۔ کیمبرج کا تعلیمی چھلکا اُتر رہا تھا، اور درندگی و بہیمیت کا مغز نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "آپ تو ماشاءاللہ بہت پڑھے لکھے ہیں۔ مَیں آپ کے مقابلہ میں جاہل

محض - جہاں تک میں آپ کے نظریہ کو سمجھ سکا ہوں، عورت اس قابل نہیں کہ دو شریف اسکے لئے آپس میں کشت وخون کریں - یہ آخر آپ اپنے کو اس وقت اتنا گرانا کیوں چاہتے ہیں ؟ "

میں جانتا تھا کہ میرا ہر فقرہ موسوی کے لئے تیر و نشتر کا کام دے رہا ہوگا لیکن مجھے اس وقت انکے ستانے میں مزہ آرہا تھا - اس لئے میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا " گھر تشریف لے جائیے، نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنئے، پھر ٹھنڈے دل سے میرے اور اپنے معاملات پر غور کیجیے - شریفانہ فعل آپ کے لئے یہی ہے کہ آپ اب اس خیال کو ترک کردیں اور زینت کو مجھے حوالے کردیں - اوّل تو آپ کو پوری صنف سے نفرت ہے - دوسرے آپ خود زینت کو ذلیل و کمینہ خیال کرتے ہیں ! "

موسوی نے ایک بار کانپ کر دونوں ہاتھوں سے مُنھ چھپا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں وہ بولے " بھائی کاظم یہی تو نہیں ہے - میں تو اس سے اب محبت کرنے لگا ہوں ! "

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی - موسوی نے میرا رنگ بدلتے دیکھ کر گڑگڑانا شروع کیا - " کاظم ! کاظم ! خدا کے واسطے دوستی کا کچھ حق ادا کرو - ہم لوگ ایک ساتھ پلے، پڑھے اور بڑھے ہیں - آج تک کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ کسی کو کوئی شکایت ہوتی - کیا اب اتنے

دنوں کی دوستی کے بعد ہم میں رقابت بھی ہوگی۔

مَیں سناٹے میں تھا۔ ایک ایک کرکے پادر ہوا قلعے گر رہے تھے خیالی پلاؤ کا مزہ بگڑا جاتا تھا۔ کیا کہتا۔ وہ کہہ چلے۔

"خدارا تم اب دخل انداز نہ ہو، بنی بنائی بات نہ بگاڑو۔ میرے سارے نظریئے زبانی تھے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، مَیں بغیر اس کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ میری زندگی کی ساری مسرتیں، ساری خوشیاں بس اسی کے دم سے وابستہ ہیں۔ اگر وہ نہ ملی تو میرے لئے جینا محال ہے!"

مَیں عجیب مصیبت میں تھا۔ جو کچھ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے وہی میں اُن سے کہہ سکتا تھا۔ میں ان سے کہیں زیادہ قابلِ رحم تھا۔ ان سے غریب، اُن سے کم پڑھا لکھا، اُن سے کم سن۔ پھر بھی رحم کی اُمید مجھی سے تھی۔ میں اپنی بے بسی پر رو دیا۔ وہ مجھے پسیجتے دیکھ کر اور خوشامد کرنے لگے۔

"دیکھو واللہ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو والد، والدہ اور ریشٹھ تینوں کی موت ہے۔ پھر میں بھی ایسا ہی بے حیا ہونگا جو جیونگا۔ ذرا اپنی خواہش کو ایک پلے میں رکھو اور دوسری جانب یہ چار چار پرمان لا! کسکا وزن زیادہ ہے؟"

مَیں کانپ کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ عجیب لجاجت سے مجھے دیکھا کئے۔ میں نے بالآخر گھبرا کر کہا۔ "اچھا جو تم کہتے ہو وہی ہوگا میں کوئی رخنہ اندازی نہ کرونگا۔ لیکن ایک شرط ہے"

اُنھوں نے گھبرا کر پوچھا " وہ کیا ہے ؟ "

میں نے کہا " وہ مجھے لکھ بھیجیں کہ اُنھیں اس ہونے والی قید سے آزادی منظور نہیں ! "

اُنھوں نے تھوڑی دیر غور کر کے کہا۔ " اچھا یہ بھی منظور! آج شام تک خط بھجوا دونگا۔ " یہ کہ کر وہ چلے گئے۔

شام کو نواب زادہ آئے اور بہت دیر تک دنیا کا نشیب و فراز مجھے سمجھاتے اور شرافت و نجابت کے معیار پر لکچر دیتے رہے۔ میں نے عاجز آ کر کہا :-

" بھئی خدا کے لئے دنیا کے لٹیروں کا ذکر چھوڑو۔ یہاں ہمیشہ قوی کمزور کا گلا کاٹتا ہے۔ صاحبِ زر غریب کو کچل دیتا ہے۔ یہاں نہ شریف بستے ہیں نہ ایماندار، یہ صرف ڈاکوؤں کا نگر ہے، اور ڈاکہ ہی یہاں کا پیشہ ہے۔ اس لئے ان باتوں کو چھوڑو، اگر مس زینت نے کوئی خط دیا ہو تو مجھے دو۔ لکچر نہ دو ! "

اُنھوں نے جیب سے ایک سر بمہر لفافہ نکال کر دیا، میں نے جلدی سے اُسے چاک کیا، تو اُس میں میرے پھول کی سوکھی پتیاں رکھی تھیں، اور ایک پرزے پر یہ شعر لکھا تھا :-

" عمرم بصفیرِ قفس و دام گزشت است
من زمزمۂ درخورِ گلزار ندانم ! "

سنہ ۱۹۳۰ء

پاگل؟

مظفر پاگل ہے۔ یقینی پاگل ہے۔ اسکے پاگل ہونے میں اور لوگ شک کریں تو کریں۔ مگر اُس شخص کو تو مظفر کی دیوانگی کا یقین ہی کرنا پڑیگا، جس نے اُسے دن کے دو بجے اور رات کے بارہ بجے چٹیل میدانوں اور سُنسان ویرانوں میں "رُپہلا پانی، سُنہرا پانی" گاتے سُنا ہے۔ خود مظفر کو نہ ان فقروں کی معنیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ اپنی آواز کی عدم موسیقیت کا۔ وہ گھنٹوں جُھوم جُھوم کر "رُپہلا پانی، سُنہرا پانی" کوّے سے ملتی جُلتی آواز میں اس خوش الحانی سے گایا کرتا ہے کہ بھولے بھٹکے راستہ چلنے والے کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے ہیں۔ اور آس پاس کی ہری ہری گھاس چرنے والے چوپائے بھڑک بھڑک کر دُور بھاگ جاتے ہیں۔

اُسکی وضع قطع بھی پاگلوں کی سی ہے۔ سر اور داڑھی کے لمبے لمبے بالوں میں منوں گرد بیٹھی ہوئی۔ بڑی بڑی خون کبوتر آنکھوں میں کیچڑ بھری ہوئی اور موٹے موٹے ہونٹوں کی باچھوں میں کف کی دھڑی جمی ہوئی۔ سر پر میلی چکٹ ٹوپی۔ بر میں

لمبا متعفن کُرتہ۔ اور ٹانگوں میں موٹا مارکین کا پائجامہ، اُسکی بھی یہ حالت کہ گھٹنوں تک ہر وقت کیچڑ میں اٹا رہتا اور اکثر ٹخنوں سے نیچا ہو کر موزے کا کام دیتا ہے۔ پاؤں میں جوتا خواہ نیا ہو یا پُرانا۔ چپٹا ضرور کر دیا جاتا ہے اور اُسے اس طرح زمین پر گھسیٹا جاتا ہے جیسے راہ چلنا اور جھاڑو دینا دونوں کام بہ یک وقت ضروری ہیں بھلا ان باتوں کے بعد کون کہیگا کہ مظفر پاگل نہیں ہے؟۔ سارا گاؤں اسے پاگل سمجھتا اور پکارتا ہے۔ آپ بھی یہی کہیں گے اور یہی سمجھیں گے۔ مگر.....

مگر مظفر کی ماں ہر شخص سے لڑنے کے لئے تیار ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ وہ اُسکی آنکھوں کا تارا، زندگی کا سہارا ہے۔ نہ شوہر زندہ ہے، نہ بھائی اور نہ دوسرے اعزاء۔ نہیں یہ درست نہیں۔ اعزاء ایسے جن سے اُس سے خونی رشتہ ہے ضرور زندہ و سلامت ہیں۔ دیور بھی ہے، بھاوج بھی۔ بھائی کے لڑکے بھی ہیں اور بہن کی اولاد بھی۔ ہاں مگر ایسا عزیز جو اس بیوہ کے دُکھ درد میں شریک ہو۔ جو اُس سے یہ پوچھے کہ "بی بی تمھارے دل پر کیا گزرتی ہے۔ تم دن دن کیسے کاٹتی ہو۔" کوئی نہیں۔

اسی لئے اُس کی ساری دُنیا سمٹ کر مظفر میں محدود ہو گئی ہے۔ وہی اُسکی ساری کائنات ہے۔ بیری اور بیوگی کا سہارا، اپنی کوکھ کا پیدا، اُسی طرح گود کا پالا اور کھلایا ہوا۔ جس طرح دُنیا جہان کے بیٹے ہوتے ہیں، وہ بیٹے بھی جو ماں باپ کو سونے چاندی کے محلوں میں رکھتے ہیں۔ اور وہ فرزند بھی جو بیویوں کے

کہنے میں آ کر والدین کے جنازے کو کاندھا تک نہیں دیتے۔ پھر بھلا مظفر کو دیکھ کر اس بڑھیا کی چھاتی مامتا سے کیوں نہ پھٹنے لگے؟ اور وہ اسے پاگل پکارنے والوں کو کیوں نہ پانی پی پی کر کوسے؟۔

اور بھئی ایمان ہے تو جہاں ہے۔ مظفر سب کے لئے پاگل ہو تو ہو مگر اپنی بیوہ ماں کے لئے تو وہ ہزاروں "ہشیاروں" سے اچھا ہے۔ جہاں ماں نے کوئی کام بتایا اور وہ سر آنکھوں سے اُسے بجالانے کو دوڑا، اور حرف حرف پورا کیا۔ کیا مجال کہ ذرا سا فرق تو ہو جائے۔ مینھ پڑتا ہو، یا اولے گرتے ہوں، گرمیوں کی دوپہر ہو یا جاڑوں کی رات۔ گاؤں ہی میں کام ہو یا دو چار کوس کے فاصلے پر۔ مظفر اُس وقت تک دم نہیں لے سکتا ہے جب تک کہ ماں کا حکم نہ پورا ہو جائے!۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدتوں کے وطن آوارہ جب مکان پلٹتے ہیں تو مظفر کی ماں بیٹے سے سلام کہلا بھیجتی ہے۔ مظفر ڈیوڑھی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چیخ چیخ کر نام لیتا جاتا ہے اور "اماں نے سلام کہا ہے، اماں نے سلام کہا ہے" کی رٹ اُس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک کہ مخاطب صحیح سامنے نہ آجائے اور اسے جواب سلام نہ دیدے۔ لوگ ایسا بھی کرتے ہیں کہ مظفر سے غلط طور پر یہ کہدیتے ہیں کہ "بھیا وہ اس وقت یہاں نہیں ہیں۔" وہ ذرا کھانس کر پوچھتا ہے "اماں نے اُنکو سلام کہا ہے، کہاں ہیں؟" پھر اگر کسی دوسرے گاؤں سے

متعلق کوئی کام ہوا کہہ دیا "وہ فلاں گاؤں گئے ہیں"۔ مظفر فوراً وہاں جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جب وہ چار قدم چل لیتا ہے تو دھوکا دینے والا جلدی سے کہتا ہے "ہاں تو مظفر تم وہاں جا ہی رہے ہو، ذرا یہ کام بھی کرتے آنا" اب مظفر غریب ماں کا سلام ہو بچانے اِس دہ کوس کے فاصلے پر دوسرے گاؤں چلا جاتا ہے اور وہاں پیامبری کے فرائض خواہ نہ ادا ہوں لیکن اُنکا کام ضرور کرلاتا ہے۔ یہ یقینی انتہائی حماقت اور سادگی ہے مگر......"

ایک بار برسات میں جب کہ ندی نالے، دریا سب کے سب اُمڈے ہوئے تھے اور پانی ہفتوں سے متواتر برس رہا تھا کسی شادی کے سلسلے میں مظفر کی ماں کو کسی کے ہاں جانا تھا، نئے کپڑے اور نئی جوتیاں ہونی چاہئیں کپڑے تو خیر بکس میں موجود تھے، مگر جوتیاں کیونکر آئیں۔ بالآخر کئی وقت فاقے کیے گئے اور اِن سے اُن سے قرض اُدھار لیکر دام جمع ہوا، مگر پانی دم لینے ہی نہ دیتا تھا کہ شہر تک مظفر بھیجے جائیں۔ بالآخر ساتویں دن وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے کُھل گیا جلدی جلدی مظفر کو ہمسائی کی جوتی لاکر دکھائی "دیکھو بیٹا! سوا دو روپے میں ہمسائی کے میاں شہر سے لے آئے ہیں تم بھی چلے جاؤ۔ تم بھی ایسی ہی خرید لاؤ"۔ مظفر نے ہمسائی کی جوتی اُلٹ پُلٹ کر دیکھی۔ اپنے پائجامے کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھائے اور اپنے جوتے اس شان سے پہنے جیسے نہ اُنکی ایڑیاں بیٹھ چکی ہیں اور نہ اُن کی قطع بوسیدہ سلیپر کی ہے بلکہ وہ بالکل ٹخنوں تک کے نئے بوٹ ہیں۔ اور گنگناتا ہوا،

کھانستا، تھوکتا، اور "سنہرا پانی، رُپہلا پانی" گاتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

تین کوس کی مسافت پیدل طے کرنا تھی، وہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کر ڈالی اور شہر میں پہونچا۔ ہر دوکان پر خواہ وہ بساطی کی ہو۔ بزازکی، میوہ فروش کی، یا کسی اور کی ہو۔ پوچھتا چلا "آماں نے جوتا مانگا ہے، تمھارے پاس ہے؟" کوئی اُسکی صورت دیکھتا اور چُپ رہ جاتا، کوئی نیک دل سیدھا سادا جواب دیدیتا مگر بعض شریر استہزا بھی کرتے۔ دیوانہ سمجھکر پھبتیاں بھی کستے۔ اور خفا بھی ہوتے۔ جب کوئی بہت سختی سے جھڑکتا تو وہ نہایت سادگی سے کہتا "ارے بھائی کیوں خفا ہوتے ہو، آماں نے کہا ہے "جوتہ لینگے"، اور پھر کچھ زیرلب بڑبڑاتا آگے بڑھ جاتا۔ خدا خدا کرکے ایک جوتوں کی دوکان پر بھی یہی سوال کیا۔ اُس دوکاندار نے اسکی صورت پر نظر کی پھر پوچھا "دام لائے ہو" مظفر نے جلدی سے ازار بند سے کھول کر دام دکھائے۔ اُس نے بھی جوتے دکھانا شروع کیے، مگر پاگل سمجھ کر ایک کا ڈیڑھ مانگتا، یہ کہتا "نہیں یہ ویسا نہیں جیسا آماں نے مانگا ہے"۔ بالے اُس طرح کا بھی جوتہ نکلا، اب دام پر بحث ہونے لگی۔ یہ کہتا "آماں نے سوا دو روپیہ دیا ہے۔ ہم اتنے ہی میں لیں گے"۔ وہ کہتا "ڈھائی سے کم میں نہ ملیں گے لینا ہو تو لو، ورنہ دوسری دوکان دیکھو"۔ یہ کہکر اُس نے سارے جوتے بکسوں میں بند کرکے رکھنا شروع کردیے۔ مظفر اب تو گھبرایا۔ اسے محسوس ہوا کہ ماں کا محبوب جوتہ جیسے کوئی چھینے لیتا ہے۔ جلدی سے ہاتھ جوڑے "دیدو، اماں کو تکلیف

ہوگی۔ سوا دو روپیہ لیلو۔" دوکاندار کچھ منغص ہو چکا تھا اس نے دیوانے کی لجاجت کا کچھ خیال نہ کیا اور دوکان سے سختی سے دھتکار دیا۔

مظفر کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اتنی دوکانوں پر پوچھنے کے بعد وہ جوتے ملے، جو ماں نے مانگے تھے۔ مگر دوکان والا نہ دیتا تھا یہ تو ماں کے ساتھ صریحی ظلم تھا۔ غریب بیوہ پر۔ کوئی اسکا پوچھنے والا نہیں۔ اب ماں کیسے شادی میں جائیگی۔ برادری میں عورتیں کہینگی سوا دو روپیہ والا جوتہ نہ پہن کر آئیں۔ لوگ ذلیل کرینگے۔ کچھ نہ سمجھ میں آتا کہ کیا کریں۔ نہ یہ عقل میں آتا کہ دوسری دوکانیں دیکھیں۔ نہ یہی ذہن میں آتا کہ گھر پلٹ چلیں۔ ماں نے جوتے مانگے تھے، وہ اِس دوکان پر موجود تھے۔ وہ سامنے والے بکس میں بند تھے۔ مگر دوکاندار نہیں دیتا۔ پھر وہ بے بس ہو کر وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔ سارا دن بیٹھا رہا۔ دھوپ تھی، اور اِس طرح کی تیز اور سخت دھوپ، جو برسات میں پانی کھل جانے پر ہوتی ہے۔ مگر نہ تمازت آفتاب کی پروا تھی، نہ جاتی ہوئی سڑک کی۔ اسکی اماں والے جوتے سامنے دوکان میں رکھے تھے، اس پر نظر جمی تھی۔ انھیں کوئی چھوتا نہ تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے پر دوکاندار سے لجاجت سے کہتا "اماں کے جوتے دیدو" اور جب وہ ڈانٹ دیتا چپ ہو جاتا۔ دوکان پر گاہک آتے، جوتے خریدتے، چلے جاتے۔ مگر یہ ٹکٹکی باندھے بس اُس ڈبے کو دیکھ رہا تھا جسمیں اسکی اماں کے جوتے رکھے تھے .....

..... کہ اتنے میں ابر محیط آیا، برق چمکی، رعد نے گرج کر بادلوں کا جگر پانی کر دیا۔

موٹی موٹی بوندیں گرنا شروع ہوئیں۔ سڑک سے لوگ بھاگنے لگے۔ جن کے پاس چھتریاں تھیں انھوں نے چھتریاں کھول لیں، جن کے پاس برساتیاں تھیں، انھوں نے وہ اوڑھ لیں۔ اور ہر ایک لمبے لمبے قدم رکھنے لگا۔ مظفر بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جائے کہاں؟ ۔ سامنے ہی دوکان میں تو اماں کی پسند کا جوتہ رکھا تھا۔ زمین نے پاؤں پکڑ لیے۔ دوکاندار کو بڑی لجاجت سے دیکھا۔ اُس نے مُنھ پھیر لیا۔ معلوم ہوا ٹانگوں کی طاقت کسی نے سلب کر لی۔ بھدسے سڑک پر بیٹھ گیا۔ اب تیز ہوا چلنے لگی اور ہر قطرۂ آب تیر کی طرح جسم پر آکر لگتا۔ مگر اُسے پروا نہ تھی۔ ہوا اور تیز ہوئی اور دفعتاً انڈے کے برابر اولے پٹر پٹر، پٹر گرنے لگے۔ ہر ایک اس طرح جسم پر آکر لگتا جیسے کوئی پتھر کھینچ کھینچ کر مار رہا ہو مگر وہ ستون کی طرح اپنی جگہ قائم رہا۔ ماں کے جوتے سامنے تھے، سامنے والی دوکان میں۔ اُسکو نہ ہوا ہلا سکتی تھی، نہ پانی اور نہ اولے۔ یہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ سارے کپڑے بھیگ گئے، سردی کے اثر سے دانت بجنے لگے۔ مگر جوتوں پر سے نگاہ نہ ہٹی۔ بالآخر دوکان میں پناہ لینے والے گاہکوں نے دوکاندار سے سبب پوچھا اور روداد سُنی۔ سب نے مل کر لعنت ملامت کی، اور پانی کم ہوتے ہی اُسے جوتے دلوا کر روانہ کر دیا۔

مطلع صاف تھا، پانی کُھل چکا تھا، مگر ہوا کی سردی رگ و پے میں پیوست ہو چکی تھی۔ مظفر کے سینے پر سردی کا اثر تھا اور جوڑ جوڑ میں درد تھا۔

دن بھر کے فاقے سے چکر آرہا تھا مگر وہ ماں کے جوتے کو سینے سے لگائے گنگناتا، لڑکھڑاتا، تھوکتا، اور "روپہلا پانی، سنہرا پانی" گاتا چلا جا رہا تھا۔

ہاں ہاں مظفر پاگل ہے یقینی پاگل ہے۔ اِس لئے...... اِس لئے کہ جب مظفر سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا اماں کے جوتے لئے مکان میں داخل ہوا تو گو اس کا سارا جسم بخار سے جل رہا تھا مگر ماں اسکا سر سینے سے لگائے، اس کے اُلجھے خاک بالود بال اپنی سوکھی اُنگلیوں سے برابر کر رہی تھی اور اُسکی آنکھوں سے آنسو مظفر کے سر پر ٹپک ٹپک کر تیل کا کام دے رہے تھے!

۱۹۳۱ء

انتقام

سکھیا چمارن نے ٹھلیا بھر کے کنوئیں کی "جگت" پر رکھی اور "بابوجی" کو بغور دیکھا۔ وہ مردانگی کے سارے جوہروں سے آراستہ تھے جوان تھے، خوبصورت تھے۔ قوی ہیکل تھے۔ رعب داب والے تھے" اگر باوجود ان باتوں کے وہ سکھیا سے ہنس بول لیتے تھے تو اسکے یہ معنی کیوں ہوں کہ ان کی نیت خراب تھی۔ سکھیا گاؤں کی بہو تھی۔ ابھی نئی نئی "گونا" کرا کے آئی تھی۔ سب ہی دو گال ہنس بول لیتے تھے۔ 'بابوجی' کے دل لگی کرنے میں کون سی بُرائی تھی؟ پھر بھی اتنا فرق سکھیا ضرور محسوس کرتی تھی کہ 'بابوجی' کی نظر اس پر اس طرح کی نہ پڑتی تھی جس طرح اور مردوں کی۔ اُن کی آنکھوں میں تو لالچ دکھائی دیتا تھا۔ بالکل اس طرح کا لالچ جس طرح گیدڑ کی نظر میں درخت پر پکا ہوا آم دیکھ کے جھلکتا ہے۔ وہ سکھیا سے ہنسی بھی کرتے تھے تو دوسروں کی طرح سب کے سامنے نہیں بلکہ نظر بچا کے۔ پھر دانت بھیچ کے مُنھ ہی مُنھ میں نہ معلوم کیا کیا

کہہ ڈالتے تھے۔ یوں کہتے تھے کہ خود سکھیا بھی اُن کے الفاظ کو صاف صاف نہ سُن سکتی تھی۔ البتہ اُنکے تیور اور اُنکے چہرے سے بہت کچھ مطلب سمجھ میں آجاتا تھا۔

اسی لیے اس وقت شام کو جب کہ سکھیا کنوئیں پر بیلوں کی ناند میں پانی ڈالنے کے لئے اکیلی پانی بھرنے آئی تھی تو وہ 'بابو جی' کو اپنے قریب دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر اپنی صنفی فطرت سے اس نے فائدہ اٹھا کے 'بابو جی' پر اپنا اضطراب ظاہر ہونے نہ دیا۔ اس نے اُن پر بالکل اسی طرح کی نظر غلط انداز ڈالی جس طرح وہ گاؤں کے کسی بوڑھے مرد پر ڈالتی۔ وہ خاموشی اور اطمینان سے کنوئیں کی "جگت" پر چڑھ گئی۔ اُس نے ڈوڈر میں ٹھلیا پھنسائی اور کنوئیں میں لٹکا دی۔

مگر 'بابو جی' کی یہ حالت تھی کہ وہ اسکی پتلی کمر اور بھرے بھرے بازو دیکھنے اور چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور بازو بند کی جھنجھناہٹ سُننے کے بعد اپنے ہوش ہی میں نہ تھے۔ صنفی لذات کا مجموعہ سامنے تھا۔ تصور نے اس میں نمک مرچ ملا کے عجیب طرح کی چاشنی انکے کام و دہن میں پیدا کر دی تھی۔ وہ جیسے جیسے قریب آتے جاتے تھے انکا چہرہ سُرخ ہوتا جاتا تھا، اُنکی کنپٹی کی رگیں پھولتی جاتی تھیں اور انکے تنفس میں سرعت پیدا ہوتی جاتی تھی۔

جب سکھیا نے بار آور شاخ کی طرح جھک کے بھری ٹھلیا 'جگت' پر رکھی تو وہ اُسکے مُنھ کے قریب مُنھ لے جا کے بڑی لجاجت سے بولے "آخر ہم کب تک تڑپیں؟"

سکھیا نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا - جھوپڑی دُور تھی - گاؤں کئی سَو
قدم کے فاصلے پر تھا - دِیا جلانے کا سمے تھا، مکان دُھندلے دکھائی
پڑتے تھے - قریب والے امرود کے باغ کے درخت ہرے کی جگہ کالی، بلکہ
قریب قریب سیاہ نظر آتے تھے - چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں،
البتہ بڑے چمگادڑ جُھنڈ کے جھنڈ اُڑتے دکھائی دیتے تھے، اور دُور سے
کبھی کبھی گائے کے "بچھڑے" کے بولنے کی ہلکی آواز آتی تھی -

سکھیا نے ایک ہی نظر میں موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا - بابو جی بہت دنوں
سے جس موقع کی تاک میں تھے، وہ آج تاریکی اور تنہائی کے چلتوں، اُنھیں
مِل گیا تھا - وہ جانتی تھی کہ زمیندار کے جبر کے آگے ایک نہ چلیگی - وہ ٹھاکر تھے
اُنکے سامنے چمارن کی کوئی نہ سنیگا - اکیلی وہ "ہاتا پائی" میں جیت نہ سکیگی
چیخنے چلّانے میں بدنامی اور رُسوائی ضرور ہوگی - اِسی لئے وہ بہت جلد اس
نتیجے پر پہونچی کہ لڑائی سے صلح بہتر ہے -

وہ جگت پر سیدھی کھڑی ہو کے بولی "بابو جی - آپ ٹھاکر ہیں، او
ہم پرجا - ایسی بُری بُری بات کاہے مُنھ سے نکالیے ؟"

اُنھوں نے والہانہ انداز سے کہا "جب سے تجھے دیکھا ہے، نہ کھا
اچھا جان پڑتا ہے نہ پانی - سچ کہوں "جل کھاتا ہوں" تو جان پڑتا ہے نیم کا
رس ہے - اور روٹی ایسی ہے کہ جیسے "چام" دانت سے نوچ نوچ کھا

ہوں - اب تو بس تیرے بنا نہ جیونگا!"

سکھیا بہت اطمینان سے وہیں "جگت" پر کنوئیں میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی اور اُسکی ٹانگیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے اسکے دل کی حرکت میں کوئی خاص سُرعت ہے اور نہ دماغ میں کسی خطرناک بات کا خیال ہے بلکہ وہ اپنی "سکھیوں" کے ساتھ میٹھی میٹھی باتوں اور ہنسی ٹھٹھول میں مشغول ہے - وہ ٹھاکر صاحب سے بولی "تو بابو جی، آپ کیا چاہتے ہیں ؟"

اُنھوں نے دانت نکال کر کہا "کچھ نہیں - یہ جو تن بدن میں آگ لگی ہے بس اسے بجھا دے "

سکھیا نے بڑی سنجیدگی سے کہا "آگ پانی ڈالنے سے بجھتی ہے، پر تیل سے بھڑکتی ہے - آپ جو بات کہتے ہیں وہ تیل ہے پانی نہیں ہے !"

اُنھوں نے بڑے اصرار سے کہا "نہیں نہیں بجھ جائیگی !"

اس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا - پھر مُڑ کے کہا "آپ سوچیں تو میں آپ کے چمار کی استری ہوں، آپ کی چھاتی سے لگوں، پھر اُسکی چھاتی سے لگوں تو آگ لگیگی کہ بجھیگی ؟ "

وہ بڑی تکنت سے بولے "اونہہ، اسے چھوڑ دے - ہم زندگی بھر نباہ دینگے !"

اس نے بات بنائی "اچھا تو پھر سوچ دیکھئے ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی - وہ بیاہ کے لایا ہے اسکے چھوڑنے میں کچھ سمے لگیگا -"

ٹھاکر صاحب نے بہت جبر کیا۔ ممکن ہے کہ کچھ اور کہتے۔ مگر عین اسی موقع پر سکھیا کے شوہر "نربیتا" نے جھوپڑی سے آواز دی "ارے نا مد سوکھی پڑ بانی لائیگی یا کنواں پر ہی مر گئی !"

سکھیا نے جلدی سے کھڑے ہو کے کہا "آوت ہن" اور جلدی سے گھڑا اُٹھا کے وہ جھوپڑی کی طرف چل دی۔

اِس گفتگو کو دو ہفتہ ہو گیا۔ سکھیا یہی سوچتی رہی کہ نربیتا سے اسے دُہرائے یا نہیں۔ جانتی تھی کہ اسکا مزاج تیکھا ہے۔ زرا سی بات میں بگڑ اٹھتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ بات اور بڑھ جائے، ہمت نہ پڑی۔ مُنھ سی کر بیٹھ رہی۔ مگر بابو جی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔ اُنھوں نے اس درمیان میں "چمرٹولی" کے کئی پھیرے کئے۔ شام صبح کنوئیں پر ضرور آتے۔ اور گو "سکھیاں" سکھیا کے ساتھ ہوتیں، مگر وہ گھورنے اور ٹھنڈی آہیں بھرنے سے نہ رُکتے تھے۔ جہاندیدہ بڑی بوڑھیاں جنھیں زمینداروں سے اپنے اپنے عہد شباب میں سابقہ پڑ چکا تھا، ذاتی تجربوں کی بنا پر معاملے کو بھانپ گئیں۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ شدہ شدہ نربیتا اسکے شوہر کو بھی معلوم ہو ہی گیا۔

اِس نے اس جہالت سے کام لیا جسکے مرد اکثر شکار ہوتے ہیں اور بجائے اسکے کہ وہ بیوی کی محبت پر بھروسا کر کے ان باتوں سے اثر نہ لے، وہ سکھیا پر طرح

طرح سے غصہ کرنے لگا۔ کہتا "زمیندار کو تیری باتوں سے اُمید ہوگئی، جب ہی وہ اِس طرح منڈلاتا ہے"۔ کبھی کہتا "اگر میں نے تجھے اُن سے ہنستے یا بولتے دیکھ لیا تو مار ہی ڈالونگا، جان دیدونگا اور جان لے لونگا"۔

وہ پہلے تو سمجھاتی رہی، پھر اُسکے دل میں بھی کدورت بڑھنے لگی۔ اُس نے ایک دن شوہر کی باتوں سے جل کر کہا "تم نے وہ مثل نہیں سُنی؟ عورت روٹھے تو آپ سے، نہیں تو جائے سگے باپ سے۔ اگر میں ایسی ہوتی تو بیٹھی نہ رہتی۔"

وہ اِس وقت تو قائل ہو کر چُپ ہو رہا، لیکن شبہہ دل سے نہ گیا۔ اور جاتا بھی کیسے، اس نے خود ہی بیج بوئے تھے۔ خود ہی سوچ سوچ کر اُنکی آبیاری کرتا اور خود ہی ان کے نمو اور شادابی سے گھُلتا۔ دُنیا میں اِس بے وقوف سے زیادہ احمق نہیں جو خود اپنے کو احمق بنائے!

ایک دن ٹھاکر کے یہاں کام تھا، دھان کٹ کے اور "اُسلے" آگیا تھا۔ چاول کوٹنا تھے۔ گاؤں کی چمارنیں بُلائی گئیں۔ سکھیا بھی گئی۔ اور سب تو اوکھلی اور موسل لیکر بیٹھ گئیں، لیکن اسے ٹھکرائن نے دالان اور کمرہ لیپنے کا کام سپرد کیا۔ یہ دروازے سے جا کر گوبر اکٹھا کر لائی اور اسے ایک جھوے میں لیئے کمرہ میں پہونچی۔ جیسے ہی اس نے جُھک کر گوبر کا جھوا رکھا۔ ٹھاکر صاحب نے آکر پیچھے سے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

ٹھکرائن بھی ٹھیک اُسی وقت آگئیں اور بے قصور چمارن کو مجرم میں شریک سمجھکر برس پڑیں۔ ٹھاکر صاحب تو بیوی کی صورت دیکھتے ہی کچھ جھیپ کر باہر بھاگ گئے۔ لیکن سکھیا کی شامت آگئی۔ ٹھکرائن نے ہزاروں گالیاں دیکر اُسکے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑے اور کھینچتی ہوئی باہر لائیں۔ دوسری چمارنیں بھی آکر جمع ہوگئیں، مالکن کا بدلا ہوا رُخ دیکھکر سب کی سب اسکے خلاف ہوگئیں کوئی کہتی "ارے ٹھکرائن، اِسی بڑی پاجن ہے۔ جس دن سے گاؤں میں آئی ہے بس مَردن کے پیچھے دوانی ہے۔" کوئی کہتی "ہا، ہا۔ رام رام۔ کاہیکا کوئی ایسا کرم کرے۔ گاؤں کا ٹھاکر پر نگاہ ڈالے، پھر انھیں کی مہریا کے سامنے اِرام۔ رام!" کوئی بولی "پوری چمڑولی کی ناک کٹوا دی۔ رہ جاؤ، چلے دو۔ ابھی پوری برادری بُلا کے سب کے سامنے ٹاٹ باہر کرا کے دم لونگی!" غرض جتنے مُنھ اُتنی زبانیں۔ اور ٹھکرائن کی یہ حالت، کہ ایک سانس میں ہزاروں گالیاں دیتیں۔ سکھیا غریب گھبرائی ہوئی ہر ایک کا مُنھ دیکھتی۔ اگر تجربہ کار ہوتی، اپنی بے قصوری پر ہزاروں قسمیں کھاتی۔ لیکن ناتجربہ کار پہلی مرتبہ اچانک ایک اجنبی مَرد نے اسکو گلے سے لگایا۔ وہ اپنے احساسات و جذبات ہی کا اندازہ نہ کر سکتی تھی کہ بلائے ناگہانی کی طرح ٹھکرائن آئیں اور آتے ہی اس طرح برسیں کہ اللہ تیری پناہ۔ چمارنوں نے جن سے ہمدردی کی امید ہو سکتی تھی اُنھیں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ کوئی سنے تو وہ کہے، کوئی

بولنے دے تو وہ بولے۔

اِس ہنگامہ میں اسکے سوا اور کچھ اسکی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ٹھاکرائن کی گرفت زرا ڈھیلی ہوتے ہی بھاگ نکلے۔ چنانچہ موقع پاتے ہی سر پر پاؤں رکھکر بھاگی۔ اور ٹھاکر کے گھر سے باہر نکل کر اس نے دم لیا۔ پہلے تو بھاگی ہوئی چمر ٹولی کی طرف چلی۔ جب جھونپڑی کوئی پانچ سو قدم رہ گئی، دفعتاً ٹھٹک گئی۔ اب تو جھونپڑی میں جانے پناہ نہ تھی بلکہ وہاں میاں بیٹھا ہوگا۔ وہی جو عہد کر چکا تھا کہ ذرا سی بدنامی ہوئی اور جان لیگا اور جان دیگا۔ دوسرے چمارنیں بھی تھوڑی دیر میں "پانی پینے" کی چھٹی پائینگی اور آتے ہی برادری بھر میں یہ بات مشہور ہو جائیگی۔

گھر کی طرف سے رُخ پلٹ گیا۔ کھیتوں کی طرف چلی۔ ہانپ رہی تھی۔ خشک سسکیاں آرہی تھیں اور آنکھوں کے نیچے بار بار اندھیرا ہو جاتا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ بس چلی جارہی تھی کہ دفعتاً اپنے کھیت کی مینڈ دکھائی دی۔ ایسا محسوس ہوا کہ کوئی دوست مل گیا۔ بھدے کنارے پر بیٹھ گئی۔ پہلے شغلاً حواس درست کرنے کے لئے کھیت سے مٹی اُٹھا اُٹھا کر ہاتھوں میں ملتی رہی۔ شاید اس سے بوے محبت آئی۔ اس لئے کہ ضبط کا قلعہ آہستہ آہستہ ٹوٹا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہوے۔ گھٹنوں پر سر رکھ لیا اور وہ زار و قطار رونے لگی

کوئی گھنٹہ بھر تک وہ اسی طرح اپنی حالت پر روتی رہی۔ پھر اُٹھی اور

اُس طرف چلی جدھر اسکا میکا تھا۔ ماں، باپ مر چکے تھے۔ بھائی تھا، شاید وہ آڑے وقتوں کام آئے۔

نرمیتا نے چمارنوں کی زبانی یہ واقعہ سُنا۔ خاصا بھوت اُس پر سوار ہو گیا۔ لاٹھی کاندھے پر رکھ کر وہ بیوی کو تلاش کرنے نکلا۔ پوچھتا ہوا کھیت پر آیا۔ وہاں بھی نہ ملی۔ سوچا " ہو نہ ہو وہ میکے گئی ہو"۔ اور غصہ بڑھا "چھکا چھبیل کر کے گھر بھائی کے پاس چلی۔ تب تو سہی کہ راستا ہی ماں نہ روکوں"۔ ڈگی اس راہ پر ہو لیا جو سُسرال جاتی تھی۔ دو کوس جانے پر وہ جاتی ہوئی دکھائی دی سر جھکائے ہوئے میانہ روی سے چلی جا رہی تھی۔ لیکن چال سے آثارِ غم نمایاں تھے نرمیتا کو بھلا یہ سب کہاں سجھائی دیتا تھا، وہ غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے وہیں سے پکارا " ٹھہر جا، کہاں جاتی ہے؟ " سکھیا کے لئے شوہر کی آواز " سمندِ ناز کے لئے تازیانہ" بنی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چال ڈھال، وضع قطع سے محسوس ہوتا تھا سر پر خون سوار ہے، بے تحاشا بھاگی۔ میاں بیوی میں دَوڑ ہونے لگی۔ راہ چلتے گھبرا کر رک پڑتے۔ مگر ان دونوں کے نتھنوں سے گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی اور دوڑ جاری تھی۔ پھر بھی کہاں تک؟ صنفِ نازک لاکھ صحیح و تندرست و توانا سہی، مگر جسمانی حیثیت سے مرد کا مقابلہ مشکل ہے۔ پھر نرمیتا بھی کوئی کمزور مرد نہ تھا۔ دیہاتی، کسان، محنت مزدوری کا عادی۔

اُس نے بیوی کو پکڑ ہی لیا۔ اور برابر آتے ہی اُسکا چوٹا کھینچ کے اس زور سے جھٹکا دیا کہ سکھیا "آہ" کر کے چاروں شانے چت زمین پر گر پڑی۔ لاتوں اور گالیوں کی بارش ہونے لگی۔ سکھیا درد اور تکلیف سے چیخنے لگی۔ شور و غل سُن کے دو چار آدمی جو پاس کے کھیتوں میں اپنے اپنے کام میں لگے تھے جمع ہو گئے۔ سب نے مل کے سکھیا کو چھڑایا۔ واقعہ پوچھا۔ نرپتیا غصے سے بولا "یہ..... گاؤں کا ٹھاکر سے پھنسی ہے!" اور پھر پل پڑا۔ لوگوں نے بیچ میں آ کے کہا "تو گھر لے جاؤ۔ وہاں مارو پیٹو۔ جو جی چاہے کرو۔ یہاں رستے میں یہ بات اچھی نہیں"۔

غرض نرپتیا اسے گرفتار کر کے لایا۔ اپنی جھوپڑی کی صورت دیکھ کے غصہ اور بھڑک اُٹھا۔ لاٹھی کے "ہورے" سے اُسے مار مار کے گھر کے اندر ڈھکیلا۔ سکھیا رو رو کے جس قدر اپنی بے قصوری کا اظہار کرتی تھی وہ اسی قدر خفا ہوتا تھا۔ اتنا ہی اسے بیوی کے جُرم کا یقین آتا جاتا تھا۔ وہ بھی مار کھاتے کھاتے تھک کے خاموش ہو رہی اور دیہاتی جاہل عورتوں کی طرح اس نے اپنے دل میں کچھ ٹھان لی۔

شب میں یوں ہی منہ لپیٹے پڑی رہی۔ نرپتیا تھوڑی دیر تو بیٹھا "نریل" پیا کیا، پھر غصہ کی آگ بجھانے تاڑی خانہ چلا گیا۔ وہاں اُس نے اتنی چڑھائی کہ مشکل سے دس گیارہ بجے گھر آ سکا، اور آتے ہی کھُرّے پلنگ پر پڑ کے سو رہا۔ قریب ایک بجے رات کے سکھیا اُٹھی، اُس نے نرپتیا کے چہرے کو بغور دیکھا، وہ

بدمست پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ وہ پھر اس کونے میں گئی جہاں چولھا تھا اور برتن باسن کے ساتھ غلہ اور دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ اُس نے آہستہ سے چولھا روشن کیا۔ تھوڑا سا کڑوا تیل ایک پیالے میں گرم کیا اور ہانڈی میں سے افیون نکال کر اُس میں ڈال دی۔ جب گرم تیل میں افیون خوب مل گئی تو وہ گرم ہی گرم پورا پیالہ پی گئی۔ پھر چپکے اٹھی، کُلّی کی۔ آگ بجھائی اور زرمتیا کے قریب آ کر لیٹ رہی!

صبح کو زرمتیا باوجود خمار کے بیوی کے کراہنے اور تڑپنے کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھا۔ گالی دے کر پوچھا "کیا ہے رے؟"۔ وہ اسی طرح کراہتی اور تڑپتی رہی۔ وہ جھلّا کر اٹھا۔ زور زور سے جھنجھوڑ کر پوچھا "کیا ہے رے؟" وہاں ہوش وحواس درست ہوتے تو جواب ملتا۔ اسکا غصہ اور بڑھا۔ سارے قصور ایک ایک کر کے یاد آتے گئے۔ سمجھا بنتی ہے۔ دو طمانچے کس کس کے سکھیا کے منہ پر رسید کیے۔ اُنگلیوں کے گال پر نشان ابھر آئے، مگر نہ وہ سر سے کھیلی اور نہ مُنہ سے بولی۔ اب تو اسکے دل میں ڈر پیدا ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہو۔ جلدی سے دیا سلائی ٹٹول کر اُٹھائی اور مٹی کا دیا جلایا۔ بیوی کا چہرہ دیکھتے ہی کانپنے لگا۔ 'کافر جوانی' کے جوش کی جگہ موت کے علامات تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقہ، چہرہ مٹی کے رنگ کا، باچھوں میں خون بھرا ہوا اور حلق سے کھرکھراہٹ کی آواز۔ جلدی سے دیا سلائی ہاتھ سے رکھی، لوٹے میں 'جل' لایا اور حلق میں نے کر منہ پر

چھڑکا، جھنجھوڑا، پکارا۔ جب سوائے کراہ کے کوئی جواب نہ ملا تو یقین آگیا کہ اس نے کچھ کھا لیا۔ جھونپڑی سے دیوانہ وار نکلا، عزیزوں کو وہیں سے کھڑے ہو کر آوازیں دیں۔ سب جلدی جلدی وہاں آئے، اور ان میں سے ایک جہاندیدہ نے گھر کا جائزہ لیکر بتایا کہ افیون کا اثر ہے اور جان بچنا مشکل۔

نرپتیا کے دل سے سارے شبہات بیوی کو مرتا دیکھکر جاتے رہے۔ اِسے سکھیا کی عصمت مآبی کا یقین آگیا۔ ساتھ ہی زمیندار کی طرف سے نفرت و غصہ بھی بڑھا۔ لوگوں نے کہا "جاؤ زمیندار سے کہو، وہ چوکیدار کو ساتھ کر دینگے، اسپتال لے جاؤ۔ شاید بچ جائے"۔ نرپتیا کا مُنھ زمیندار کا نام سنتے ہی سُرخ ہو گیا۔ چیخ کر بولا "اُسی کا تو یہ کرتوت ہے! اسی نے ہماری مہریا کی جان لی ہے!" نوجوان چماروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "چلو ابھی مار کے گرا دیں ابھی اسکو بھی پھونک دیں" کی آوازیں بلند ہونے لگیں، مگر دو چار بوڑھے بھی ان میں تھے انھوں نے ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے چپ کیا۔ "جمیندار کو مارنگے! بڑا گھمنڈ ہو گیا ہے، منی ایسی بات کا ہے کے کہ جو نہ کر سکے!" اور سب تو چُپ ہو رہے، مگر نرپتیا گڑاسی اُٹھا لایا۔ اس پر خاصا بھوت سوار تھا۔ بولا، "اچھا۔ اچھا تم سب لوگ یہیں بیٹھے رہو، ہم اُس سسرے کو مار آتے ہیں!" دو تین چمار لپٹ گئے اور اُس سے گڑاسی چھین لی۔

اتنے میں سکھیا تڑپ کے اُٹھی۔ دوسری چمارنوں نے جلدی سے اُسے

سنبھالا، مگر وہ ایک طرف جھک گئی۔ اور اُس نے تڑپ تڑپ کے اور چیخ چیخ کے خون کی قے کی۔ پھر قبل اسکے کہ چمار میں اسکا مُنھ دُھلا سکیں اسکا سر ڈھل گیا، اور اسکے ہاتھ پاؤں اینٹھ کے رہ گئے۔

نرپتیا جب مرگھٹ سے واپس آیا تو وہ سیدھا نائی کے گھر گیا۔ اس نے سر ڈاڑھی اور مونچھیں مُنڈوا ڈالیں۔ پھر گاؤں کے بزاز کے یہاں گیا۔ اُس سے اُس نے دو گز مارکین لی، پھر کمھار کے یہاں گیا۔ وہاں سے اُس نے مٹی کی ایک ہانڈی خریدی، پھر گھر آیا۔ وہاں سے اُس نے تھوڑا سا نیا سَن لیا اور ایک ٹین کا کنستر۔ اور یہ سب چیزیں لے کے وہ تالاب گیا۔ وہاں اُس نے "اشنان" کیا۔ دو گز مارکین تہمد کی طرح باندھی، پھر سَن پانی میں بھگو بھگو کے اُسکی رسّی بٹی۔ ایک سرا اُسکا مٹی کی ہانڈی میں باندھا، دوسرا ہاتھ میں لیا۔ اس ہانڈی کو پھر اسی طرح لٹکا کے تالاب سے پانی بھرا اور جو سرا ہاتھ میں تھا اپنی گردن میں باندھ لیا۔ اب وہاں سے کنستر پیٹتا ہوا چیختا چلا:۔

"دہائی کالی مائی کی، دہائی گنگا مائی کی! ہم جمیندار پر بھوت بلائب (بلائینگے) ہم جمیندار پر مسان ہنکائب (ہنکائینگے) ہم جمیندار پر بھوت بلائب! گاؤں کا عورت مرد، بوڑھا بالک سب لوگ سُن لیں، ہمار سامنا سے سب ہٹ جائے۔ ہم جمیندار پر بھوت ہنکائب۔ ہم جمیندار پر بھوت بلائب!"

گاؤں میں جو بھی اسکی یہ آواز سُن لیتا اسکے راستے سے ہٹ جاتا۔ لڑکے ڈر کے گوشوں میں چھپ جاتے۔ عورتیں گھروں میں پلٹ جاتیں اور بڑے بوڑھے ایک دوسرے کو دیکھ کے سر ہلاتے لگتے تھے۔ وہ اسی طرح کنستر پیٹتا اور چیختا ہوا زمیندار کے گھر کے چاروں طرف پھرا۔ پھر اُن کے مکان کے سامنے جو بکائن کا درخت تھا اس پر اس نے ہانڈی کو لے جا کے لٹکا دیا، اور خود اپنی گردن میں اسی رسّی کا ایک سرا باندھ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ ہر پانچ منٹ کے بعد کنستر پیٹتا اور یہی چیختا تھا۔ "دہائی پنچوں کی! دہائی سمارے بھائیوں کی! دہائی ہندو مسلمانوں کی! جمیندار ہمارا استری کی لجت بگاڑس ہے (زمیندار نے میری بیوی کی عزت لی ہے) جمیندار ہماری بھریا کی جان لی رس ہے! ہم جمیندار پر بھوت بلائب۔ ہم اوپر مسان منکائب! کوئی ہم کا نہ روکے! جیہ کا پوت پیارا ہو، ہم سا دور رہے۔ جیہ کا آپن پران دیا ہمارے پاس نہ آوے! دہائی کالی مائی کی! مسان بھیجو! اہن جمیندار کا سراپر بھیجو۔ اہی دبا! پر بھیجو۔ اہی ٹھاکر پر بھیجو! ہے رام! ہے لچھمن! ہے بھگوان! توں ہی بھیجو۔ اہن بھیجو! آج بھیجو! دہائی کالی مائی کی! دہائی کالی مائی کی! توں ہی بھیجو۔ اہی گھڑی بھیجو!"

ٹھاکر صاحب بیوی کے کمرے میں اچانک آ جانے کی وجہ سے

گھر سے سراسیمہ ہو کے بھاگے تھے۔ چوری کرتے دیکھ لیے گئے تھے۔ اپنے کیئے پر خجل و منفعل تو تھے ہی، سکھیا کے پیٹے جانے کی خبر نے شرمندگی میں اور زیادتی کر دی تھی۔ شب کو بیوی کے پاس جب اندر گئے تو دل میں بیحد سہمے ہوئے تھے۔ رات بڑی بے چینی اور بدمزگی سے کٹی۔ صبح ہوتے ہی سکھیا کی خودکشی کی خبر ملی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر گاؤں کے مکھیا بھی تھے۔ چوکیدار کو بلا کے اُسکے ہاتھ گرمائے اور اُسے سمجھا دیا کہ بات تھانے اور کچہری تک نہ پہونچنے پائے اُس نے چماروں کو ڈرا دھمکا کے ٹھاکر صاحب کے پاس آنے سے روکا اور لاش مرگھٹ پہونچوا دی۔

ٹھاکر صاحب نے ذرا اطمینان کی سانس لی ہی تھی کہ شام کو نرپتیا نے یہ روپ بھرا۔ اب تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سارے جسم کی جان ہی نکل گئی۔ بڑے بوڑھوں سے چماروں کے بھوت بلانے کا حال سُن چکے تھے۔ یقین ہو گیا کہ اب خیریت نہیں ہے۔ گھبرائے ہوئے ٹھکرائن کے پاس پہونچے۔ وہ مہری کے ذریعے پہلے ہی سب کچھ سُن چکی تھیں۔ اور شوہر پر غصہ کرنا بھول کے اُن کی جان کے ڈر سے بیٹھی کانپ رہی تھیں۔ ان کو جو دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ یہ انھیں سمجھا بجھا کے گھبرائے ہوئے باہر آئے۔ وہاں نوکر چاکر سب موجود تھے۔ مگر سب توہم پرست دیہاتی تھے۔ کسی نے آج تک یہ نہیں دیکھا کہ چمار کا مسان بلایا ہوا کبھی پٹ پڑا ہو۔ کسی کے کوئی بات سمجھ

میں نہ آتی۔ اُنھوں نے جوہر ایک کو حسرت سے دیکھنا شروع کیا تو ایک نے آگے بڑھ کر کہا "بابو جی کہیے تو پنڈت جی کو بُلا لائیں"۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ جلدی سے بولے "ہاں ہاں اُنھیں کو بُلا لاؤ"۔

پنڈت جی آئے۔ وہ بھی ساری روداد سے واقف تھے۔ مگر خود بھی جاہل ہونے کی وجہ سے انھیں توہمات میں گرفتار تھے۔ پھر بھی پشتہا پشت سے گاؤں کے پروہت تھے۔ اپنی معذوری کا اقرار کر کے "ساکھ" کیسے کھوتے۔ راستے بھر سوچتے آئے تھے کہ کون سی شرط ایسی لگائی جائے کہ بات نہ جانے پائے، چاہے اور کچھ ہو یا نہ ہو۔

براجمان ہونے پر بڑی دیر تک پوتھی "بچارتے" رہے۔ پھر بولے "ہاں بس اس کی ایک روک ہے، آج آدھی رات تک ایک ایسا بکرا کالی مائی کو چڑھایا جائے جو منگل کے دن پیدا ہوا ہو، سال بھر کا ہو، سارے جسم سے کالا ہو پر پیشانی پر اسکے چندرماں سی سپیدی ہو"۔

ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر ملازموں کی طرف دیکھا۔ ہر ایک نے کہا، "گاؤں میں ایسا بکرا تو کہیں نہیں ہے!"

پنڈت جی نے زرا ڈانٹ کر کہا "تو ڈھونڈھ کے دوسرے گاؤں سے لے آؤ!"

ٹھاکر صاحب نے کہا "ہاں ہاں! گڑریوں سے کہو، جہاں سے ہو

ایسا بکرا ڈھونڈ لاؤ۔"

نوکروں نے روپے لئے اور کوٹھی سے نکل گئے

ٹھاکر صاحب نے اِس شب میں 'بھوجن' نہیں کیا۔ ٹھکرائن بھی یونہی بھوکی رہیں۔ رات کی سیاہی جیسے جیسے پھیلتی جاتی تھی ٹھاکر صاحب کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ گھر کے گوشہ گوشہ سے بھیانک صورتیں دکھائی دینے لگیں۔ بیوی سے ڈر کا حال کہتے شرم معلوم ہوتی تھی۔ مگر جان پر بنی تھی، پھر اس پر ہر پانچ منٹ کے بعد اس دُہائی کی آواز سنائی دیتی۔ ہر بار یہی معلوم ہوتا کہ موت آیا ہی چاہتی ہے۔ اسی اضطراب میں ٹھکرائن کی نظر بچائے اُٹھے، طاق پر گنو ماتما" کی مورتی رکھی تھی، اُسے اُٹھا لائے۔ چادر اسر سے پاؤں تک اُڑھ لیا، ماتما سے خوب گڑگڑا کے دعائیں مانگیں، توبہ کی، روئے، پناہ مانگی۔ تھوڑی بہت تسکین سی محسوس کی، اور سو گئے۔ بارہ بجے کے قریب آنکھ کھلی، گھر بھر میں اندھیرا تھا، صرف ایک گوشے میں لالٹین حد درجہ دھیمی کر کے رکھی تھی۔ پاس ہی پلنگ پر بیوی سوئی تھیں۔ ان کا خوف سے بند بند کانپ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا انھیں جگا دیں۔ مگر شرم سے ہاتھ نہ اُٹھتا تھا کہ دفعتاً کان میں نرپتیا کی آواز آئی "دُہائی کالی مائی کی! دُہائی کالی مائی کی! جلد مسان بھیج، جلد بھوت بھیج! ایسی جمیندار پر! ایسی جمیندار کا اوپر!

انھیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کوئی انکے گلے میں پھندا ڈال کے کھینچ رہا ہے - اپنی قوتِ آزادی سے کام لیکر اس سے بہت لڑے - مگر جیسے دل کہتا "سب بیکار ہے"، "اٹھو چل!" یہ آخر اسی طرح کانپتے ہوئے اُٹھے - ایک دھندلا سا سایہ آگے آگے چلتا ہوا دکھائی دیا - ایسا محسوس ہوتا "سکھیا چلی جا رہی ہے" ٹھاکر کو اب کوئی بات محسوس نہ ہوئی - اب دماغ کی ساری قوتیں اسی دھندلے جسمہ پر جمی ہوئی تھیں - دل کہتا اسی کے پیچھے چلو - اسی کے ساتھ ہو لو - خود ہی انھوں نے کنڈی کھولی، زنانخانے سے مردانے مکان میں پہونچے - ان کو اسکا احساس نہ تھا کہ یہ کہاں ہیں، اور کس کے مکان میں ہیں - یہ تھے اور بس وہ دھندلی تصویر - وہ اپنے مکان کے مردانے حصے سے نکل کے سیدھے بکڑیا کے درخت کی طرف چلے، جہاں نرمتیا گردن میں رسی باندھے دہائی دے رہا تھا - سایہ اُسی جانب جا رہا تھا، انکا دم اسی کے ساتھ تھا - یہ بھی ادھر ہی جا رہے تھے - انکا ہاتھ کسی نے پیچھے سے پکڑ کے انھیں روکنا چاہا - انھوں نے ہاتھ جھٹک دیا - یہ مدہوش تھے - ان سے سوچنے، سمجھنے اور سننے کی ساری قوتیں سلب تھیں - بس انھیں اگر کوئی چیز سجھائی دیتی تھی تو وہی سایہ، اور کوئی آواز سنائی دیتی تھی تو وہی نرمتیا کی آواز!

بکڑیا کا درخت قریب ہوا - اور قریب ہوا - نرمتیا دہائی دیتا ہوا کھڑا لیا - اس نے انکو دیکھ لیا - اس نے ہاڑی جلدی جلدی درخت سے

کھول لی - اِس نے رسّی اپنی گردن سے کھولی - اِس نے اسکا ایک بڑا پھندا بنایا - اُس نے وہ پھندا اُنکی گردن کی جانب پھینکا - اُنھوں نے تاریکی اور بدحواسی میں درخت کی اُبھری ہوئی جڑ سے ٹھوکر کھائی اور قبل اسکے کہ پھندا انکی گردن میں پڑے یہ مُنھ کے بھل گر پڑے !-

---

ٹھکرائن اپنے ڈر کو دل میں چھپائے شوہر کی حالت کو بغور دیکھ رہی تھی - وہ عورت تھی - اُسکا دل نازک تھا - وہ اُنکے افعال و حرکات سے خوش نہ تھی - مگر ہندو عورت شوہر کو دیوتا کی طرح پوجتی ہے - وہ بُرا سہی یا بھلا اُسکا ہی تھا - اُسکا سُہاگ اسی سے ہے - اسکی ہستی، اسکی چوڑی، اسکی نتھ، اسکے سر کا سیندور، سب کچھ اسی ایک دم کے ساتھ ہے - وہ جان پر کھیلنے کے لئے تیار تھی - وہ اسکے لئے آمادہ تھی کہ نرمتیا کی کالی مائی پر اگر کوئی بھینٹ چڑھے تو وہ اُسکی ذات ہو نہ کہ اُسکے سرتاج کی -

وہ سارے دن دیوی جی سے یہی دعا کرتی رہی - رات کو جب یہ مُنھ لپیٹ کے سو رہے تو وہ بڑی دیر تک اُن کو محبت اور پریم سے دیکھا کی - پھر اُنکے سینے سے "دگنو ماتا" کی مورتی لپٹی دیکھ کے اور اُنھیں آرام کی نیند سوتے پا کے اُسکی بھی آنکھ لگ گئی - مگر جب یہ پلنگ سے اُٹھے اور بُت کی طرح خاموش کنڈی کھول کے باہر جانے لگے تو وہ جلدی سے پلنگ سے اُٹھی

اور ننگے پاؤں انکے پیچھے پیچھے لپکی ۔ اس نے کوئی سایہ اور تصویر نہ دیکھی ۔ صرف انکی بدحواسی اور اُن کی مدہوشی محسوس کی ۔ اس نے جلدی جلدی دو قدم بڑھائے اور ریگرو یا تک پہونچنے کے پہلے اس نے ٹھاکر کا ہاتھ پکڑ کے روکنا چاہا ۔ مگر وہ اسکو ڈھکیل کے آگے بڑھ گئے ۔ وہ صرف ایک لمحہ جھجکی، اور پھر انکے ساتھ ہولی ۔ اور انکے گرتے ہی جیسے نرپتیا نے رسّی ہاتھ سے پھینک کے یہ چاہا کہ وہ پانی کی ہانڈی انکے سر پر دے مارے، اُس نے بڑھ کر اِس چمار کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ چمار لال آپے سے باہر ہوا مگر وہ عورت کو دیکھ کے ٹھہر گیا ۔ اُس نے جھلا کے پوچھا "کون ہے رے ؟"

ٹھکرائن نے کہا "بھیا میں ہوں ٹھکرائن"

نرپتیا گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا ۔ صدیوں سے محکوم رہنے والا خون ٹھکرائن کا نام سنتے ہی سرد پڑ گیا ۔ بولا " ای ہماری مہریا کا بے اجت کہن، ای اُہکا مار ڈالن !"

ٹھکرائن نے اُسکا ہاتھ تو چھوڑ دیا، مگر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کے بولی "بھیا تمھاری بیوی کو ہم نے مارا ۔ انھوں نے مارا اور تم نے بھی مارا ۔ ہمی قصور دار کیوں ہیں ؟"

نرپتیا کا غصہ اِس سُریلی آواز کے اثر سے اسی طرح اُترنے لگا جس طرح سانپ کا غصہ سپیرے کی بین کی آواز سُن کے ۔ اُس نے دھیمی آواز سے کہا

دو نا ہیں۔ ایسی مارن۔ ایسے اُہ کا ٹنگ کیہن۔ ایسے اُہکا پیچھے پیچھے چمرٹولی، کھیت، کھلیان، ہر جاگہ گھومت رہن!"

ٹھکرائن نے کہا "نہیں نہیں۔ اُنھوں نے صرف بُری نیت سے دیکھا، مگر میں نے اسکو بُرا سمجھ کے اسے جھونٹا پکڑ کے گھر سے باہر نکالا، اور تم نے اسے ڈنڈوں سے مار مار کے یہ یقین دلا دیا کہ تم اسے بے عصمت سمجھتے ہو۔ میں نے بھی اسکی جان لی اور تم نے بھی۔"

نربتیا اس نئی منطق پر گھبرا گیا۔ اُس نے شب سے کچھ نہ کھایا تھا۔ چوبیس گھنٹے کے فاقے نے اسے حد درجہ کمزور کر دیا تھا۔ محض بدلہ لینے کی خواہش اب تک اسے دُہائی دینے اور مسان، ہنکانے پر آمادہ کئے ہوئے تھی۔ اس طرح اپنے خیالات پریشان ہوتے دیکھکر وہ اپنے میں عجیب طرح کی کمزوری محسوس کرنے لگا اور نہ زمین پر ہانڈی رکھ کے تھرا کے بیٹھ گیا۔ ٹھکرائن نے اس چمار کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "بھیا اب اسکی جان گئی۔ ان کی جان نہ لو۔ بھوت نہ ہنکاؤ۔ میں تمھاری ٹھکرائن ہوں، مجھے ان کی جان بھیک دیدو!"

نربتیا نے کانپ کر دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا لیا۔ ٹھکرائن نے اُسکے پاس رکھی ہوئی ہانڈی کو اُٹھا لیا اور شوہر کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔ نربتیا لڑکھڑاتا اُٹھا اور وہ ٹھاکر کے مکان کے دروازے پر آ کر اُنکے نوکروں کے نام لے لے کے پکارنے لگا! ٹھکرائن کے میٹھے بول نے جادو کا سا اثر دیا تھا، اس کے پاس ان نشتروں کا توڑ نہ تھا! یہ نیا انتقام تھا!

سنہ ۱۹۳۲ء

ازالۂ غلط فہمی

داروغہ امیر احمد اپنی حد درجہ خوش قسمتی سمجھے کہ بیگم صاحبہ نے اپنی منہ بولی بہن کی لڑکی اُن سے منسوب کر دی۔ تیس برس کے سن میں یہی کیا کم تھا کہ بیگم صاحبہ کی سی رئیس زادی کے داروغہ بن بیٹھے تھے۔ پوری جائداد کی آمدنی، تمام مکانات کا کرایہ، اور سال بھر کا پورا وثیقہ انھیں کے ہاتھوں خرچ ہوتا تھا۔ سیاہ و سپید کے مالک تھے، جو چاہتے انتظام کرتے جس سے چاہتے سختی برتتے، جس سے چاہتے نرمی کرتے۔ نہ کہ بیگم صاحبہ اتنی مہربان ہوں کہ اپنی بھانجی کے ساتھ۔ وہ منہ بولی ہی سہی، انکا عقد کر دیں۔ پھولے نہ سماتے۔ محاورے کے لحاظ سے نہیں بلکہ حقیقتاً جب سے قمر بانو سے شادی ہوئی تھی پچھلی شیروانیاں تنگ ہو گئی تھیں اور داروغہ جی کا وزن دُگنا ہو گیا تھا۔

بیوی خوبصورت بھی تھی۔ مطیع بھی۔ اور خوش سلیقہ بھی۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد جب داروغہ جی گھر واپس آتے تو وہ پھول کی طرح کھل جاتی۔ خود ان کے منہ ہاتھ دھولانے کا انتظام کرتی۔ خود ہی جلدی سے چائے ناشتہ لاکر سامنے

رکھتی، اور اصرار کرکے اُنھیں ایک کی جگہ چار پوریاں کھلا دیتی۔

اتنا ہی نہیں بلکہ گھر میں ہر چیز سلیقہ سے اپنی جگہ صاف شفاف آئینہ سی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی تھی کبھی یہ نہ معلوم ہوتا کہ معمولی اوسط درجے کی آمدنی والے کا گھر ہے۔ یا یہ کہ ان داروغہ جی کا گھر ہے جو رشوت اور تنخواہ ملا کر سوا سو مہینہ پیدا کر لیتے ہیں۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا کہ کسی ہزار ڈیڑھ ہزار کمانے والے کی کوٹھی ہے۔ خود قمر بانو کی صفائی کی یہ حالت کہ ہر روز کپڑا بدلنا ضروری تھا۔ ہر وقت حسن کے تمام اسلحوں سے آراستہ رہتی تھی۔ جب داروغہ جی دیکھتے دل بے اختیار چاہتا کلیجے میں بھر لو۔ چنانچہ دونوں حد درجہ خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ داروغہ جی کو قمر بانو میں سوائے دو باتوں کے کوئی ایسی بات نہ ملی جو ذرا بھی ان کے مزاج کے خلاف ہوتی۔ مگر یہ باتیں بھی معمولی تھیں۔ اوّل تو وہ ہر دوسری تیسری شام کو کسی نہ کسی سکھی سے ملنے ضرور جاتی، اور دوسرے وہ جواہر نگار زیورات کی بیحد شائق تھی۔ شروع شروع میں تو وہ ذرا اسکے آنے جانے میں روک تھام کرتے رہے، پھر انھوں نے اسکی صحت کے خیال سے یہ بھی ترک کر دیا۔ دل میں کہتے غریب دن بھر گھر میں بند رہتی ہے۔ دم اُلجھتا ہوگا۔ شام کو ذرا ادھر اُدھر ہو آئی، تفریح ہو گئی۔ پھر ماشاء اللہ شہر کے ہر محلے میں اُسکے عزیز و اقارب ہیں، نہ ملیگی تو کیا کریگی۔ بیوی جو اتنی خدمت کرے، اتنی مطیع ہو، اتنی نیک ہو، وہ اتنی آزادی کی بھی مستحق نہیں کہ وہ ہفتہ میں دو ایک بار

اپنی سہیلیوں اور عزیزوں سے مل آئے۔

دوسری بات جو شروع شروع میں داروغہ جی کو کھٹکی وہ قربانو کا جواہر نگار زیورات کا شوق تھا۔ کوئی مہینہ ایسا نہ خالی جاتا جس میں وہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز پھیری والے سے نہ خرید لیتی تھی۔ یہ کہتے "بھئی اس طرح پیسہ پھینکنے کا کیا نتیجہ۔ جب اللہ نے ہمیں اتنا نہیں دیا کہ تم سچے جواہرات پہن سکو، تو یہ جھوٹے نگ، جھوٹے موتی، شیشہ اور امیٹیشن پہننے کا کیا نتیجہ؟ ماشاءاللہ تمھاری عصمت تمھارے حُسن کو یونہی چار چاند لگائے ہوئے ہے۔ ان جھوٹے شیشوں کی کیا حاجت ہے؟"

وہ اِس پر مُسکرا کر کہتی "صاحب میں کیا کروں۔ مجھے جواہرات سے عشق ہے، سچے نہ سہی جھوٹے ہی سہی۔ میں اپنی فطرت کیسے بدل دوں۔

یہ کہتی جاتی اور اُس بار سے کھیلتی بھی جاتی، جس میں بڑے بڑے موتی اِس طرح کے آویزاں تھے کہ ہر ایک ہزار ہزار روپے سے کم کا نہ معلوم ہوتا۔ پھر نہایت سادگی سے کہتی "دیکھیے یہ کتنے خوبصورت ہیں۔ بالکل اس طرح کا آب ہے، جیسے سچے ہی ہیں۔"

داروغہ جی اس دوہرے وار کا جواب سوائے مُسکرانے کے اور کیا دے سکتے تھے؟ چُپ ہو جاتے۔ اور اگر اُنھوں نے کبھی کچھ کہا بھی تو اپنے دل ہی سے "بھئی بچہ پنا مزاج میں کوٹ کر بھرا ہے۔ نہیں مانتی۔ کیا کریں۔ اور بھئی اگر عورت میں اتنا بچہ پنا بھی نہ ہو تو وہ محبت کرنے کے قابل ہی نہیں۔"

کبھی کبھی شام کو وہ بڑے احتیاط سے اپنے انھیں جواہرات کا صندوقچہ اٹھالاتی۔ اور کبھی سرخ عقیق کا گلوبند نکالتی۔ کبھی زمرد کی انگوٹھیاں، کبھی ہیرے کی چوڑیاں۔ اور انھیں روشنی میں چمکا کر انکی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی اور خوب کھل کھلا کر ہنستی۔ پھر کمر لچکا کر آگے بڑھتی اور اپنے نازک نازک ہاتھوں سے انھیں کی پیشانی پر ٹیکہ لٹکا کر موتیوں کی لڑی انکے بڑے بڑے بالوں میں پھنسا دیتی پھر دونوں کانوں میں بندے لٹکا کر خوب ہنستی۔ اور کہتی "اِس داڑھی مونچھ پر اور یہ زیور! کیا صورت ہو گئی ہے، واہ واہ واہ!" اور جب یہ چیں بجبیں ہوتے تو ان زیوروں کو اُتارتے اُتارتے گود میں بیٹھ جاتی اور گلے میں باہیں آویزاں کر دیتی۔ اب دارو غہ جی مسکراتے نہ تو کیا کرتے؟

غرض یہ قربانو کو باوجود اسکے ان دو "کمزوریوں" کے دل سے پیار کرتے اور روز روز انکی محبت بڑھتی جاتی، کہ ایک روز شام کو دسمبر کے مہینہ میں وہ کسی کے یہاں ملنے گئی۔ تھوڑی دیر میں گھنگھور گھٹا آئی اور چمک اور گرج کے ساتھ آئی۔ مینھ برسا اور جم کر برسا۔ کئی گھنٹے کے بعد جو زرا بوندیں کم ہوئیں تو بیگم صاحبہ کے یہاں سے لپکے ہوئے سردی سے ٹھٹھرتے گھر پہونچے۔ وہاں دیکھا تو بوی ابھی تک واپس نہیں آئی، سخت پریشان ہوئے۔ نہ معلوم کہاں گئی، کس حالت میں ہے۔ کہیں بھیگی نہ ہو۔ اگر یہ جانتے کہ کس کے یہاں گئی ہے تو کہلا بھیجتے وہیں رُک جاؤ۔ عجیب بے بسی تھی اور عجیب پریشانی۔ کہ پانی پھر بڑھا۔ ابکی اولے بھی

پڑنے لگے۔ خداوندا تو رحم کرنا۔ تو ہی اسے عقل دینا کہ اس آفت میں گھر سے نہ نکلے۔ دعا ہی مانگ رہے تھے کہ کہار ڈولی لیکر پہونچے۔ اتری تو دیکھا کہ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی ہے۔ پانی سے شرابور، سردی سے یہ حالت کہ دانت بول رہے ہیں۔ خفا ہو کر پوچھا "اِس آفت میں آنا ہی کیا ضرور تھا، وہیں رُک جاتیں"۔ وہ مُسکرا کر بولی "اور آپ جو پریشان ہوتے؟"

بس سارا غصہ ڈھل گیا۔ جلدی جلدی کپڑے بدلوائے۔ رضائی خود ہی جلد جلد اُڑھائی، انگیٹھی میں آگ پلنگ کے قریب کھوائی۔ مگر دونوں مل کر بھی فطرت سے جنگ میں کامیاب نہ ہوئے۔ دھان پان تو تھی ہی۔ دسمبر کی سردی اور اولے اپنا بھرپور وار کر گئے۔ تھوڑی دیر میں بخار چڑھ آیا۔ بلغم نے سینے میں گھر کیا، اور ایک ہفتہ میں قمر بانو داروغہ جی کا نرم نرم بستر اور اپنے چمکتے جواہرات سب کچھ چھوڑ کر خاک میں سو رہی۔

داروغہ جی نے حد سے زائد رنج کیا۔ مہینوں ایسا ہوا کہ تین تین وقت کھانا نہ کھایا، ہر وقت روتے رہے۔ بیگم صاحبہ کے یہاں کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ کام کاج، ملنا جلنا سب کچھ ترک کیا۔ بیوی کی تمام چیزیں ایک علیحدہ کمرے میں بند کر دیں۔ صبح اُٹھ کر خدا اور رسول کو یاد کرنے کی جگہ اسی کمرے میں جا کر بیٹھتے۔ خوب آنسوؤں سے مُنہ دھوتے۔ پھر بیوی کی قبر پر چلے جاتے۔ وہاں بیٹھے رہتے۔ دوپہر تک وہاں سے واپس آتے۔ گھر پہونچ کر مُنہ لپیٹ کر پڑ رہتے۔

نوکروں میں سے کسی نے اگر بے حد خوشامد کی تو تھوڑا بہت کھا لیا ورنہ وہ بھی نہیں۔

لیکن اس طرح کی زندگی وہی بسر کر سکتا ہے جس کے یہاں خزانہ دفن ہو، یا بینک میں بہت سا جمع ہو۔ انکے یہاں تھا ہی کیا، بیگم صاحبہ کی نوکری کا سہارا وہ چھوڑ ہی دی تھی۔ ایک مہینہ ہی میں گھر کا اساسہ بکنے لگا۔ آہستہ آہستہ نوکر بھی کھسکنے لگے۔ ماما، دائیوں نے بھی اپنے اپنے گھر کی سدھ بھری۔ وفا پیٹ بھرو ں سے ہو سکتی ہے، فرزد بھلا کیا کرینگے؟۔ ہر ایک نے اپنا اپنا ٹھکانا ڈھونڈا۔ اب یہ بالکل اکیلے دم رہ گئے۔ مگر پھر بھی سیکڑوں روپے ماہوار خرچ کرنے کے عادی تھے، ساری چیزیں ایک ایک کر کے بیچ ڈالیں۔ البتہ قمر بانو کے کمرے میں ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ جب فاقے ہونے لگے اور وفورِ غم گھٹا تو اسکی طرف بھی توجہ ہوئی۔ اسکی یادگاریں بھی فروخت کرنے لگے۔ تھوڑے دنوں انکے سہارے بسر ہوئی۔ اب کچھ نہ رہ گیا۔ صرف وہ بکس تھا جس میں وہ جھوٹے موتیوں والا ہار، وہ شیشے والے زیورات رکھے تھے۔ حسرت سے دیکھتے اور دل ہی دل میں کہتے "کاش ان میں سے کوئی شے اس عصمت مآب نے سچی ہی خریدی ہوتی!"

ایک دن، جب کہ دو وقت ہو چکے تھے کہ ایک چاول بھی اڑ کر انکے منہ میں نہ پہونچا تھا، انھوں نے اس صندوقچے کو کھولا، اور اس میں سے موتیوں کا ہار نکالا۔ سوچا کہ چلو کسی کو دکھائیں۔ پانچ سات روپے کی چیز ہوگی، ایک آدھ دن ہی رہیں گے۔ ایک جوہری کی دوکان پر پہونچے، ڈرتے ڈرتے پہلے رومال سے

ہار نکالا اور اُسے دکھایا۔ اُس نے انکی پھٹی حالت دیکھی، ہار کو دیکھا پھر سر ہلا کر بولا "نہیں صاحب میں نہ لونگا۔"

اُنھوں نے کہا "بھئی اسکی قیمت تو آنک دو!"

اُس نے پھر ہار کو اُٹھا کر دیکھا، اور بولا "پندرہ ہزار!"

ایسا معلوم ہوا پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ شاید ان سے مذاق کر رہا تھا۔ دل میں کبیدہ ہوئے۔ ہار اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ مگر بھوک ضبط سے باہر تھی۔ قیمتی ہو یا معمولی۔ بیچنا ضروری تھا، شہر کے سب سے بڑے جوہری کے پاس پہونچے۔ اِس نے ہار دیکھتے ہی کہا "یہ تو میری ہی دکان سے خریدا گیا تھا۔"

ان کو اب اسکے قیمتی ہونے کا یقین آگیا۔ مگر یقین آتے ہی عرق عرق ہو گئے۔ نیچی نگاہیں کر کے پوچھا "کتنے کا ہے؟"

اس نے رجسٹر منگوایا۔ ڈھونڈھ کر نکالا۔ بولا "بیس ہزار کا ہے....."

اب موتیوں کا بھاؤ گھٹ گیا ہے۔ اس وقت اٹھارہ ہزار کی مالیت ہے۔"

اُنھوں نے خشک لب چاٹے، پھر بولے "میں بیچنا چاہتا ہوں۔"

اُس نے رجسٹر پھر بغور دیکھا اور پوچھا "آپ کو کیسے ملا؟"

اُنھوں نے آہستہ آہستہ رُک رُک کر اس طرح جواب دیا، جس طرح مجرم اقرار جرم کرتا ہے "یہ میری بیوی قمر بانو کا ہے۔ وہ مر گئیں!"

اس نے سر ہلا کر کہا "ہاں انھیں کے لئے خریدا گیا تھا....."

تو اگر آپ بیچنا چاہتے ہیں تو دو گھنٹہ بعد آئیے۔ میں ذرا تحقیق کر لوں ——
اور ہار یہیں چھوڑ جائیے ۔"

اُنھوں نے رسید لے لی اور دکان سے باہر چلے آئے۔ دنیا آنکھوں میں تاریک تھی۔ جسکی عصمت کی قسم کھا سکتے تھے۔ جو مجسمہ عفت تھی وہ اِس طرح کی .... چکر آنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی دم گھونٹے دیتا ہو۔ غش کھا کر گر پڑے۔

ہوش آیا تو خود کو ایک انگریزی دواخانے میں بنچ پر لیٹا پایا۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھکر نقاہت اور کمزوری کے رفع کرنے کے لئے دوا پلادی۔ عادتاً جو جیب میں دام دینے کے لئے ہاتھ گیا تو وہاں پیسہ کہاں ؟ بڑی تکلیف ہوئی۔ معاً ہار یاد آیا۔ اور بیوی ...... مُسکرائے اور شکریہ ادا کر کے لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ پھر جوہری کے یہاں پہونچے۔ اُس نے ان پر ایک تیز نظر ڈالی۔ پھر بولا "میں نے دریافت کر لیا۔ کیا آپ اسے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں ؟"

اُنھوں نے سر ہلا کر کہا "ہاں !"

اُس نے تجوری کھولی، اور اٹھارہ ہزار کے نوٹ انھیں گن دیے۔ یہ نوٹ جب جیب میں رکھ چکے تو نظر فرش پر جائے اس طرح بولے "انکے ...... اور بھی جواہرات ہیں ...... نے آؤں "

اُس نے کہا "ہاں، ہاں، خوشی سے !"

دوسرے دن پورا صندوقچہ اُٹھا لائے۔ ساری چیزیں دکھائیں۔ ہر چیز قیمتی تھی۔ کل ایک لاکھ سے زیادہ کی مالیت نکلی۔ انھوں نے سب کی سب چھوڑ دیں۔

اُس روز شب میں پہلی دفعہ گھر کے باہر ایک غیر عورت کے پہلو میں سوئے۔ شب بھر موقع بموقع کھل کھلا کر ہنس پڑتے تھے۔ سوال پر ہمیشہ یہی جواب دیتے تھے "غلط فہمی، غلط فہمی! لیکن ازالۂ غلط فہمی کی قیمت سوا لاکھ!" اور ہر مرتبہ اس طرح کی بھیانک ہنسی ہنستے تھے کہ پوچھنے والی کو ان کے توازنِ دماغی کے بارے میں شبہ ہونے لگتا تھا!

سنہ ۱۹۳۳ء

جذباتِ لطیف

اختر صاحب نے جُھنجھلا کے چار کی پیالی سامنے سے کھسکا دی اور کہنے لگے "میں بھئی اب جذباتِ لطیف، احساسات لطیف کے سے الفاظ سے نفرت کرنے لگا ہوں!" ہم لوگوں نے اُنھیں بڑے تعجب سے دیکھا۔ ہمارے نزدیک اُردو نظم و نثر میں ان سے بہتر طور پر آج تک کسی نے جذباتِ لطیف کا تجزیہ نہیں کیا تھا۔ اُن کی نثر کا ایک ایک فقرہ اور اُنکی نظم کا ایک ایک مصرعہ اسکا شاہد تھا کہ اُنھوں نے باریک ترین اور نازک ترین احساسات کا گہرا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ انھیں پورے طور پر محسوس بھی کیا ہے۔ انکی صورت شکل بھی ایک لطافت پسند طبیعت کی چغلی کھا رہی تھی۔ گندمی رنگ، چھریرا بدن، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، پتلی ناک، پھڑکتے ہوئے نتھنے، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، مونڈی ہوئی داڑھی، میانہ قد، خوش لباس و خوش گفتار و خوش اندام۔ غرض وضع قطع، چال ڈھال سے وہ ایک نازک الحس، نفاست پسند شخص معلوم ہوتے تھے۔ اب اگر ایسا شخص اس طرح کی بات کہے تو حیرت ہونا ضروری تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ اس لفظ کا استعمال

ٹفیں کے اشعار کے سلسلے میں کیا گیا تھا اور تعریف ہی کے خیال سے۔ انھوں نے
ہماری آزردگی اور استعجاب کو محسوس کر کے اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے
کہا " معاف کیجیے گا، مجھے انکے بیجا استعمال سے کچھ ایسے صدمے پہونچے ہیں کہ
ان الفاظ کے سُنتے ہی میرے تن بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میرا مطلب
نہیں ہے کہ جذباتِ لطیف کا وجود ہی قابل نفرت ہے۔ مگر ان کی موجودگی وہیں
تک اچھی ہے جہاں تک ادب اور آرٹ کا تعلق ہے۔ جہاں ان کا انطباق
روزمرہ کی زندگی پر کیا گیا اور وہ خانماں بربادی کا سامان بن گئے! "

ہم میں سے ایک صاحب نے بحث کرنے والے انداز سے پوچھا " یہ
روزمرہ کی زندگی سے آپ کی کیا مراد ہے؟ "

وہ بولے " جی، یہی نوکری، مزدوری، افسری، ماتحتی، تجارت، زراعت،
عزاو کے ساتھ سلوک، دوستوں کے ساتھ خلوص، بیوی کے ساتھ محبت کا برتاؤ۔ "
ہم میں سے ہر ایک نے گھبرا کے کہا " کیا زن و شو کے تعلقات میں بھی
جذبات لطیف سے کام نہ لیا جائے؟ "

وہ صد درجہ متانت سے بولے " نہیں، ہرگز نہیں۔ آپ معشوقۂ مدخولہ پر
جذباتِ لطیف صرف کریں۔ مگر خدا را ہماری ہندوستانی بیویوں کو اپنے جذباتِ لطیف
سے محروم رکھیں! "

میں نے بڑے استعجاب سے پوچھا " اختر صاحب یہ آپ فرماتے ہیں۔ آپ! "

کہنے لگے "جی ہاں میں عرض کرتا ہوں اور ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کرتا ہوں، آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔ اچھا مجھ سے آپ بیتی سنیے"

ہم سب خاموش ہو کے ہمہ تن گوش بن کے بیٹھ گئے۔ وہ بھی تھوڑی دیر سا کت رہے پھر آہستہ آہستہ بیان کرنے لگے "میری بیوی کا نام لطیفہ تھا، وہ کسی امیر کی لڑکی نہ تھی۔ وہ میرے جن عزیز کی بیٹی تھی اُن کا نام حبیب اللہ تھا۔ اُن سے سارا قصبہ واقف تھا۔ وہ عجیب دل و دماغ کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے ساری زندگی جھوٹی گواہی دینے اور جھوٹے مقدمے بنانے میں بسر کی تھی، اُنکا ذریعۂ معاش یہی تھا۔ بعض لوگ ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ وہ اس ذریعے سے بڑی بڑی ترقیاں کر لیتے ہیں۔ وہ میونسپلٹی کے ممبر، کاؤنسل کے ممبر، خان بہادر، رائے بہادر ہو جاتے ہیں۔ مگر اس طرح کے ترقی کرنے والوں کی فطرت میں بڑی جرأت، بڑا استقلال ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ لوگ موقع شناس بلا کے ہوتے ہیں۔ اور ایک ہی طرح کی دغابازی تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ انکی ذہین طبیعتیں روز نئی نئی صورتیں اور تدبیریں سوچ نکالتی ہیں۔ لیکن یہ حضرت اِس قماش کے بھی نہ تھے۔ یہ جھوٹی قسم کھا لینا ایک بہت ہی معمولی سی بات سمجھتے تھے۔ اسی لئے گواہی کی مانگ بہت تھی، مگر بڑی محنت و جفاکشی کے بعد بھی وہ مہینہ میں کبھی پندرہ روپے سے زیادہ نہ پیدا کر سکے تھے۔ یہ انکی خصوصیت تھی کہ اُن کے دماغ میں کبھی کوئی نیک خیال مشکل سے آتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنکے لئے یہ کہنا کہ اس وقت دن ہے

اسی وقت ممکن تھا جب کہ اور لوگ یہ کہتے ہوں کہ اس وقت رات ہے۔ رات کو
رات کہنا یا دن کو دن اُن کے لئے محال تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی محال تھا کہ وہ رات
ور دن کے علاوہ وقت کا کوئی خاص نام رکھ لیں غرض لطیفہ ایسے باپ کی
ٹی تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ ہو بہو سیرت میں اپنے باپ کی سی تھی، لیکن اتنا تو
ماننا ہی پڑیگا کہ اسکی فطرت میں اس خون کا اثر ضرور ہی رہا ہوگا۔ ماں ہمارے
خاندان کی نہ تھیں، وہ ایرانی النسل تھیں۔ انکی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ
وہ گوری چٹی، موٹی تازی بڑی تندرست تھیں۔ لطیفہ نے صورت شکل تو انہیں
ماں باپ سے مل کے ودیعت پائی تھی۔ اُسے اگر باپ کا خرگوش نما چہرہ اور چھوٹی
آنکھیں ملی تھیں تو اسی کے ساتھ ماں کا سفید رنگ اور سخت ہاتھ پاؤں بھی ملا
تھا، نہ اس میں کوئی نزاکت تھی اور نہ کسی طرح کی کوئی لطافت۔ نہ وہ عطر لگاتی
تھی، نہ کپڑے بدلتی تھی اور نہ بال میں کنگھا کرتی تھی۔ کہتی مجھے کوئی یار نہیں
ڈھونڈھنا ہے۔ وہ چیونٹوں کے مارنے سے خوش ہوتی۔ کوؤں کے لئے آٹے
میں زہر ملا دیتی۔ بلیوں کو کمروں میں بند کر کے مار ڈالتی۔ چوہوں کے لئے ہر وقت
چوہے دان رکھتی، اور انکو پکڑ کر کتوں کو کھلاتی۔ تعلیم بھی اُس نے مسمی پائی تھی
یعنی وہ اردو کی دو ایک مخصوص مذہبی کتابیں ٹٹول ٹٹول کے اور اٹک اٹک
کے اُلٹی سیدھی پڑھ لیتی تھی۔ قرآن بھی اُس نے پڑھ لیا تھا۔ اور ہر سال
رمضان میں وہ ایک قرآن ختم کر لیتی تھی۔ مگر عربی الفاظ کا تلفظ اور اعراب کی

صحت اتنی ہوتی تھی جتنی کہ اُسکے والد ماجد کی باتوں میں صحت و صداقت ہوتی تھی۔ نماز ہمیشہ وہ گنڈے دار پڑھتی تھی۔ جب میں کسی امر پر خفا ہو کے مُنہ کالا کر کے کہیں نکل جانے کی دھمکی دیتا تھا تو وہ اس زمانے میں بڑے شغف سے نماز و ظائف پڑھتی، لیکن جب ہانڈی کے اُبال کی طرح ٹھنڈا پڑ جاتا تھا تو پھر وہ مہینوں خدا کو بھول بیٹھتی تھی۔ اور اسے نماز تو کیا طہارت بھی یاد نہ رہتی تھی۔ بس وہ دو ہی کام بہت اچھا جانتی تھی۔ ایک تو بچے پیدا کرنا، دوسرے سارے خاندان و اعزار کی غیبت کرنا اور اُنکے ہر بُرے بھلے فعل میں اپنے معنی پہنانا۔

خیر، یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔

ہاں تو اس کا فیصلہ میرے لئے مشکل تھا کہ میں نے شادی کیوں کی لطیفہ میری جانی بوجھی تھی، برادری ہی میں سے تھی۔ میں نے بچپنے میں اُسے دیکھا تھا، ساتھ کھیلا بھی تھا، جوان ہو کے وہ پردہ کرنے لگی تھی۔ مگر اس حالت میں جب میں اسکے گھر جاتا تھا تو وہ کواڑوں کی دراروں میں سے مجھے جھانک کے دیکھتی رہتی تھی اور میں بھی اُسکی ماں کی آنکھ بچا کے ضرور دیکھ لیتا تھا۔ میرے لئے اسکی صورت میں کوئی کشش نہ تھی۔ نہ بچپنے میں اور نہ جوان ہو کے میرے دل میں کبھی اسے دیکھ کے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اسے پیار کر لوں۔ وہ میرے نزدیک گیندے کا پھول تھی کہ جو دیوتاؤں کو محبوب سہی مگر ہمارے لئے جس میں نہ کوئی کشش ہے اور نہ کوئی خوشبو۔ ممکن ہے کہ میرے لئے یہ کیفیت اور زیادہ نمایاں طور پر اور بھی اس لئے پیدا

ہو گئی ہو کہ مجھے عائشہ جیسی لڑکیاں پسند تھیں۔ وہ بھی خاندان ہی کی لڑکی تھی،
جب چھوٹی تھی تو کھیل کود میں جہاں کسی نے اُسکے ساتھ بے ایمانی کی۔ یا لطیفہ
سی کسی لڑکی نے اسے کسی بات پر جھٹلا دیا تو وہ سیدھی میرے پاس چلی آتی تھی
اور میں ہی اسکا فریاد رس بنتا تھا۔ اسکی باتوں میں رس اُسی وقت سے تھا، اور
اسکی چال میں اسی زمانے سے غضب کا لوچ تھا۔ وہ بید کی طرح لچکتی ہوئی
چلتی تھی، جوان ہوکے بھی وہ ناگن سی چھریرے بدن کی ایسی اچھی نکلی تھی۔
اور اسکی آنکھوں میں اِس بلا کی معصومیت تھی کہ بس یہی جی چاہتا تھا کہ وہ کھڑی
کھڑی گھر کے کام کاج کیا کرے اور انسان دُور سے بیٹھا بیٹھا بس دیکھتا ہی
رہے۔ وہ اُن عورتوں میں سے تھی جنھیں دیکھ کے مرد کے دل میں سیکڑوں لطیف
خواہشیں، خدمت کی، ایثار کی، قربانی کی، شجاعت کی پیدا ہو جاتی ہیں لطیفہ کو
یہ بات کہاں نصیب۔ اُسے دیکھ کے انسان حیوانیت کی طرف راغب ہو سکتا تھا
مگر اس میں پاکیزہ خیالات نہیں پیدا ہو سکتے تھے۔ اسکا جسم اس طرح کا بنا ہوا تھا،
اور جوانی کے بعد اسکی آنکھوں میں اس طرح کی چمک آگئی تھی کہ اُسے تھوڑی دیر
دیکھنے کے بعد مرد کی نیت خراب ہونے لگتی تھی۔ لیکن یہ تمام باتیں میں اس قدر شدت
سے نہیں محسوس کرتا تھا، جتنا کہ اب۔ وہ زمانہ ہی ناسمجھی کا تھا، پھر بھی اتنا
ضرور محسوس ہوتا تھا کہ جس طرح دل عائشہ کی طرف کھنچتا تھا، ویسا ہی لطیفہ سے
اندر ہی اندر کراہت کرتا تھا۔ حالانکہ اعصاب اسی کی طرف راغب تھے۔

بہر نوع مجھے فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ اسکی ذمہ داری بڑے میاں نے اپنے سر اوڑھ لی۔ وہ عائشہ کے والدین سے خفا تھے۔ آپس میں کچھ زمینداری کا جھگڑا تھا۔ کسی اسامی سے انھوں نے اپنے حصہ رسدی سے آٹھ دس روپے زائد لے لئے تھے، اور بڑے میاں کے مانگنے پر بھی انھیں واپس نہ دیے۔ حبیب اللہ بھی اسی سلسلہ میں والد کے یہاں آکے اٹھنے بیٹھنے لگے۔ بڑے میاں نے ان سے خوش ہو کے اور عائشہ کے والد کو جلانے کے لئے میری شادی لطیفہ سے طے کر دی۔ اور خود ہی حبیب اللہ صاحب کی مدد کر کے بڑی دھوم دھام سے لطیفہ کو بیاہ لائے۔

شادی کے بعد تین ماہ تک میں نے اس طرح کی زندگی بسر کی جو مہذب لوگوں میں قابلِ ذکر نہیں۔ میں اس زمانہ میں انسان نہ تھا حیوان تھا۔ مگر اسکے بعد لطیفہ کے چہرے کی زردی اور طبیعت کے نڈھال ہونے نے جسمی لذات میں کمی پیدا کی۔ اور میری آنکھوں سے آہستہ آہستہ پردے اٹھنا شروع ہوے۔ میں نے حال کے ساتھ ماضی و مستقبل پر بھی نظر ڈالی۔ ماضی میں مجھے عائشہ کی معصوم آنکھیں شکایتانہ انداز سے دیکھتی ہوئی نظر آئیں۔ مستقبل میں مجھے ایک ایسی عورت شریک زندگی دکھائی دی جو زن و شو کے تعلقات کے مادی حدود سے آگے بڑھ کر کچھ نہ جانتی تھی اور نہ جاننا چاہتی تھی۔ وہ اسکی شریک زندگی صرف اسی حد تک بننا چاہتی تھی کہ وہ اس سے اپنی اعصابی ضرورتیں پوری کرے اور ساری عمر اس سے فراغتیں پوری کرائے۔ وہ اسکے لئے تیار نہ تھی کہ اسے پڑھانے کی کوشش کی جائے۔ وہ اپنی دانست

میں اپنی تمام ہمجولیوں سے زیادہ پڑھی لکھی تھی۔ وہ کہتی ہیں بیکار کے لئے اپنی آنکھیں
کیوں پھوڑوں۔ کیا مجھے کہیں نوکری کرنا ہے؟۔ میں یہ سمجھا تاکہ بھئی یہ نہیں ہے
لیکن آخر مجھ سے باتیں تو کروگی۔ تم خود کہتی ہو میں تمھاری باتوں میں دلچسپی نہیں
لیتا۔ بس ہر وقت پڑھنے لکھنے میں لگا رہتا ہوں۔ تمھیں بتاؤں میں تم سے کیا باتیں
کروں۔ تاریخ جانتی ہو، جغرافیہ جانتی ہو؟ تمھیں یہ معلوم ہے کہ انگلستان میں
آج کل وزیر اعظم کون ہے اور ہندوستان میں جو سیاسی تبدیلیاں ہونے والی
ہیں اُن کے متعلق کیا گفت و شنید ہو رہی ہے؟" میں مشکل سے اتنا کہنے پاتا
کہ وہ بول اٹھتی "اُف، ہٹو بھی کیا سڑی دیوانی باتیں ہیں۔ ہم عورتوں کو ان
موئی باتوں سے کیا کام؟ ہم سے پوچھو، آج گھر میں کیا پکا ہے۔ بچوں کے پاس
کون سا کپڑا ہے، کون سا بننے کی ضرورت ہے؟۔ برادری میں کس کے یہاں شادی
ہے جانا ہے۔ عزیزوں میں کون سی تقریب ہونے والی ہے۔ مجھے نہ تمھاری ملکی
تبدیلیوں سے مطلب، اور نہ تمھارے وہ جو ہیں وزیر اعظم۔ ہونگے نگوڑے کوئی!"
میں جھلاتا مگر خاموش ہو رہتا اور بار بار اسی پر غور کرتا کہ آخر میں نے یہ کیا حماقت
کی کہ بزرگوں کے دباؤ میں آگیا اور جلدی سے لطیفہ سی عورت سے شادی کے لئے
ہامی بھر لی۔ پھر کبھی غصے میں آکے یہ بھی سوچتا کہ "اچھا اب تو خود مختار ہوں، اب
کیوں نہ طلاق دے کے میں اس قصے کا خاتمہ کر دوں اور عائشہ کو جواب تک بن بیاہی
ہے" بیاہ لاؤں۔

چنانچہ ایک دِن میں نے لطیفہ سے یہ کہہ ڈالا کہ "تم مجھ سے طلاق لے لو،
اب میری تمھاری نہیں نبھ سکتی"۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اس وقت پلنگ پر
"رومن رولان" کا معرکۃ الآرا ناول "کرسٹوفر" پڑھ رہا تھا اور غصّے کی ابتدا اسی
امر سے ہوئی تھی کہ وہ کسی ماما دائی پر جھلا کے میرے کمرے میں چیختی داخل ہوئی
تھی اور مجھے خیالی دُنیا سے واقعی دنیا میں اچانک اور زبردستی لائے جانے سے
حد درجے کا دماغی دھچکا پہونچا تھا۔ چنانچہ کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ کے زمین پر
گر پڑی تھی، اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میرے سارے احساسات لطیف یک
وقت زمین پر گر کر پاش پاش ہو گئے تھے۔

لطیفہ طلاق کا نام سُن کے مبہوت بنی تھوڑی دیر کھڑی رہی۔ اسکا چہرہ زرد
ہو گیا تھا، وہ اس طرح کانپ رہی تھی جس طرح سموم کے پہلے جھونکے سے تروتازہ
درخت کانپنے لگتے ہیں۔ اس نے دو تین مرتبہ ہونٹ چاٹے، کچھ کہنا چاہا، منھ سے
آواز نہ نکلی۔ لڑکھڑائی اور دیوار کا سہارا لیتی ہوئی میرے کمرے سے باہر اور اپنے
کمرے کے اندر چلی گئی۔

—— میں نے کتاب پلنگ سے جھک کے اُٹھائی، میرے ہاتھ کانپ رہے
تھے، دل بلیوں اُچھل رہا تھا، میں نے دل کی بات آج لطیفہ سے کہہ تو ڈالی
تھی، مگر برسوں کے رشتے کو، اور وہ بھی اس طرح کے رشتے کو توڑ ڈالنا آسان
کام نہ تھا۔ پھر لطیفہ نے جس انداز سے یہ فقرہ سُنا تھا اور اُس پر جو اثر ہوا تھا

بھی میرے دل پر چوٹ کر گیا۔ میں مانتا ہوں کہ میں پتلی جلد کا آدمی ہوں، میں تکلیفیں نہیں برداشت کر سکتا۔ مگر اسی کے ساتھ مجھ سے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں کسی دوسرے کو بھی تکلیف دوں۔ لطیفہ کے کانپتے ہونٹ، زرد رنگ اور لڑکھڑاتی ہوئی چال، یہ ساری باتیں اس بات کی شاہد تھیں کہ میرے اچانک وار نے اسے کس حد تک مجروح کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ جس طرح وہ اور باتوں میں جذبات سے ہٹ کر صرف واقعیت (Hard facts) سے بحث کرتی ہے، اسی طرح شادی کو بھی محض اشتراکی زندگی کا ایک پہلو سمجھیگی اور عدم موانست کی وجہ سے جو اسمیں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اُنکے طے کرنے کی جو واحد صورت ہے اس پر عمل پیرا ہونے میں ذرا وہ پس و پیش نہ کریگی۔ مگر لطیفہ نے تو اس جُدائی کی خبر کو اس طرح سُنا جس طرح کسی کی سُنائی سُنتے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ پتھریلی زمین میں بھی گلاب اُگ سکتے ہیں؟ کیا اسکی سی سخت عورت کے یہاں بھی جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں یا۔ مجھے بیحد تعجب تھا، اس لئے کہ میں نے اپنی جگہ طے کر رکھا تھا کہ لطیفہ مجھ سے یہ فقرہ سُن کے فوراً مجھ سے لڑنے کے لئے تیار ہو جائیگی، خوب کوسے کاٹیگی۔ اس لئے کہ یہ اسکی فطرت تھی، وہ جانتی تھی کہ وہ میرے ساتھ اچھی خاصی آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ بھلا وہ اس طرح کی راحت خوشی سے کیوں ترک کرنے لگی۔ پلاؤ قورمہ چھوڑ کے خشک روٹی اور نمک کون پسند کرتا ہے کہ وہی پسند کرلیگی۔ مگر اُسکی خاموشی، اُسکی حسرت بھری نگاہ اور اُسکے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے لئے

میں تیار نہ تھا۔ یہ امور تو اسکی چغلی کھا رہے تھے کہ اس سنگ سیاہ کی کسی تہ

میں موم دبی پڑی ہے۔ اسکی سی عورت میں بھی جذباتِ لطیف ضرور ہیں۔ میں

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ماما نے ایک رقعہ لا کے دیا۔ لکھا تھا۔

"میرے مالیک۔ کیا آپ نے سچ مچ تلاق کا قسد کر لیا ہے!

کیا میرے بچوں پر رحم نہ کیجیے گا۔ آپ کی لون ڈی لطیفن"

اس خط میں جتنی املا کی غلطیاں ہیں ان کا اثر ایک پڑھے لکھے حساس

طبیعت والے شخص پر سوائے اسکے اور کیا پڑ سکتا ہے کہ اسے متلی معلوم ہونے لگے

چنانچہ میرے ساتھ بھی مالک میں و ے، کی زیادتی۔ طلاق میں ط، کی وجہ ت

قصد میں صاد کا سین سے بدل جانا، رحم کی حائے حطی کا ہائے ہوز بن جانا

لونڈی کا دو ٹکڑوں میں جدا ہو جانا۔ اور سب سے زیادہ لطیفہ کے سے شریف نام کا لطیفن

کنجڑنوں، دھوبنوں کا سا نام ہو جانا اس امر کے لئے کافی تھے کہ میں اپنے پچھلے سا

خیالات بھول کے جھٹ غصے سے پیچ و تاب کھانے لگوں۔ میں نے سنا کیا دیکھا

اور آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب رذیل روپے حاصل کر لیتے ہیں تو اپنے برا

نام تبدیل کر کے شریفوں کے سے نام رکھ لیتے ہیں۔ میاں جمن کو جہاں روپے کی

گرمی پہونچی اور وہ جمال یا جمیل بنے۔ تھوڑا سا اور جمع کیا اور جمال الدین

یا محمد جمیل بنے۔ جہاں ذرا اور حالت سنبھلی تو جمال الدین حسن خاں، شیخ محمد جمیل

کاشغری بن بیٹھے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس۔ شریف ماں باپ کی بیٹی، ایک

لٹمن ادیب و شاعر کی بیوی اور وہ لطیفہ سے لطیفن بن بیٹھی۔ میں نے خط کو اسی
رت سے دیکھا جسکا وہ جذباتِ لطیف کی نظروں میں مستحق تھا۔ نہ تو وہ کسی عمدہ
غذ پر لکھا گیا تھا اور نہ اس میں کسی سینٹ یا عطر کی خوشبو تھی۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ ردّی کا کوئی سادہ ٹکڑا کمرے میں پڑا تھا، اسی پر گھسیٹ دیا گیا ہے۔
ر پھر املا کے ساتھ خط۔ بالکل اس طرح کا تھا جس طرح مکھی روشنائی میں ڈوب
سارے ورق پر چہل قدمی میں لکیریں بنائے، یا پھر بہت سے مکڑا ایک ہی
رق پر مر گئے ہوں۔ مجھے یہ مثالیں یاد آتے ہی تے آنے لگی۔ میں دنیا میں ان
نوں چیزوں سے زیادہ کسی سے نہیں نفرت کرتا، بس میرے اس فیصلے کو اس خط
نے حد درجہ پختہ کر دیا۔ میں نے حد درجہ نفرت اور غصے میں اسی پرچے پر لکھا "میرا
صلہ قطعی ہے۔ میں نے تمہیں اسی وقت سے طلاق دی!"

اختر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا، جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ کانپتے
ہاتھوں سے ایک سگریٹ جلائی۔ تھوڑی دیر خاموش جلد جلد کش لیتے رہے۔ ہم
لوں پر بھی سکوت طاری تھا۔ ہم جانتے تھے کہ وہ حد درجہ ذکی الحس آدمی ہیں
امعلوم ہماری زبان سے کون سی بات نکل جائے کہ وہ اس آپ بیتی کو نا تمام
چھوڑ دیں۔ انھوں نے شیروانی کے بٹام کھول دیے اور سینے پر کے ایک چور جیب سے
یب لاکٹ نما ڈبیہ نکالی اور اس میں سے ایک پرزہ، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے
ے کسی اخبار یا کاپی میں سے نوچ لیا ہو۔ شکنیں بھی اس پر اس قدر پڑی تھیں کہ

جو بتا رہی تھیں کہ یہ صرف نوچا ہی نہیں گیا ہے، بلکہ گھنٹوں گولی بنا کے کسی مقام پر
دبایا پڑا رہا ہے۔ اُنھوں نے وہ پرزہ ہماری طرف بڑھا دیا ہے۔ یہ اُنکی بیوی کا خط
اور اُسکے نیچے اُنکا جواب تھا۔ واقعی کاغذ، خط، املا ایسا ہی تھا کہ ایک پڑھے لکھے
حساس اور غیور مرد کو اسے اپنی بیوی کی طرف منسوب کرتے شرم آنا چاہئے تھی، خود اختر
صاحب کی شان خط یہ بتا رہی تھی کہ انھوں نے حد درجہ غصے میں لکھا ہے۔ اور ایسے
شخص کے لئے لکھا ہے کہ جو شکل سے ساری عبارت پڑھ سکتا ہو۔ اس لئے کہ ایک
ایک لفظ جنچا تُلا، خوشخط، نستعلیق، صاف صاف لکھا گیا تھا، بھلا خط لکھنے میں
اتنا کون خیال کر سکتا ہے۔ اسی لئے شان خط ہی اسکا ثبوت تھی کہ یہ فیصلہ واقعی
قطعی اور آخری ہے اور کاتب نے مکتوب الیہ کو حد درجہ جاہل اور قابل نفرت سمجھ کے لکھا ہے۔

اختر صاحب نے اس پرزے کو ہم سے واپس لیا۔ ڈبے میں بند کیا۔ جیب میں رکھ
شیروانی کے بٹام لگائے اور اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہم نے گھبرا کے اُنکا مُنہ دیکھا۔ ہماری
صورتیں قصے کے اختتام کا سوال کر رہی تھیں، اُنھوں نے چھڑی پر ٹیک لگا کے کہا
"لطیفہ نے اسی شب میں افیون کھا کے جان دیدی۔ یہ خط مرتے دم تک اسکے ہاتھ
میں رہا ——— اسکی برسی کر کے میں نے عائشہ کی شادی خود کوشش کر کے ایک
اچھی جگہ کرادی ——— اور اب میں خود اپنے جذباتِ لطیف کی پاداش میں لطیفہ
کے بچے پال رہا ہوں!"

———

سنہ ۱۹۳۳ء

ہار جیت

چھیدی پور کی اہیر ٹولی سے جو ملا ہوا آموں کا باغ ہے اُسمیں بڑی چہل پہل تھی۔ نو بتیا اہیر کے یہاں رام گڈھ سے جو برات آئی تھی وہ اُسی میں اتاری گئی تھی۔ متعدد چولھے روشن تھے۔ بڑی بڑی کڑھائیاں چڑھی تھیں، پوریاں "چھن رہی تھیں"، ترکاریاں "بنائی" جا رہی تھیں۔ براتیوں کے سامنے پیلے کے پتے اور بڑے بڑے "پتر" رکھے تھے۔ "گھراتی" گرم گرم پوریاں اور "بھاجی"، ہر ایک کے سامنے "پرس" رہے تھے۔ نوجوان براتیوں میں "لاگ ڈانٹ" تھی کہ دیکھیں کون سب سے زیادہ کھاتا ہے۔ جناتیوں نے بھی پوری پر پوری پیش کرنا شروع کر دی۔ کسی نے آدھ سیر، کسی نے تین پاؤ، کسی نے سیر بھر پوریاں کھائیں۔ مگر رام دلارے کا پیٹ تھا کہ مٹکا۔ کسی طرح بھرتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک "بیٹھک" میں ڈیڑھ سیر پوریاں "چڑھا" گیا۔ پھر جب ہارنے والے مقابل نے کہا کہ "اسکی سند نہیں، پوریاں گھی میں تر تھیں، مرنے کی تھیں، گرم گرم

اور نرم نرم تھیں "تان کے کھا گئے" روٹی کھاؤ تو البتہ جانیں مرد ہو، اس نے لڑکی والوں سے دو سیر آٹا، آدھ سیر دال، اور پچیس تیس اُپلے منگائے۔ دال ایک ہانڈی میں چڑھا دی، آٹا کیلے کے پتے پر اپنے ہاتھ سے گوندھ ڈالا۔ اور اُپلوں کو مربع صورت میں ایک کے اوپر ایک "سرپا کے" رکھا۔ اور اُن میں آگ دکھا دی۔ جب اُپلے جل کے "دہکتے" ہوئے کوئلوں کے مانند ہو گئے تو اُس نے گُندھے ہوئے آٹے کی دس بارہ "بھوریاں" بنائیں۔ اور انھیں اُس آگ میں ڈال کے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دال اور بھوریاں تیار ہو گئیں تو وہ چار زانو بیٹھ کے نہایت ہی اطمینان سے اُنھیں بھی اُڑا گیا۔ مقابل نے کان پکڑ کے کہا "بابا میں ہارا: تم آدمی نہیں راکشش ہو!"

نوجوان جناتیوں نے طعنہ دیا، بہت سا کھا لینا بڑی بات نہیں، ہمارے ہاں بھینسیں ناند کی ناند صاف کر جاتی ہیں۔ کوئی "گُن" ہو تو بات ہے۔ رام دلارے ہنس کے "برہا" گانے بیٹھ گیا۔ اب جناتیوں کی طرف سے باقاعدہ مقابلہ شروع کر دیا گیا۔ جب یہ ایک برہا گا چکتا، وہ جواباً دوسرا گاتے۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوتے یہ تیسرا شروع کر دیتا۔ غرض یوں ہی سوال و جواب کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ مگر اُن میں اور رام دلارے میں فرق یہ تھا کہ وہ سُنی سُنائی چیزیں گاتے تھے اور یہ خود فی البدیہہ کہتا اور گاتا جاتا تھا۔ کئی کئی آدمیوں نے مل مل کے مقابلہ کیا۔ مگر اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے والا دوسرے کے سہارے پر بھروسا

رنے والوں کو ہمیشہ ماگراتا ہے۔ اِس لئے رام دلارے کے آگے ایک کی بھی
نہ چلی اور سب کے سب سیلی ہوئی آتشبازی کی طرح پھُس پھُسا کے رہ گئے۔

جناتیوں نے جب یہ دیکھا کہ برہے میں جیتنا محال ہے تو مقابلہ کا رُخ بدل دیا۔ ”لُرکی“ چھیڑ دی۔ یہ بلا کی چیز ہے، اسکا نہ ”اور ہے نہ چھور!“ مہابھارت ور امائن کے زمانہ سے قصہ شروع ہوتا ہے اور انتہا ہوتی ہے آج کل کے زمانے پر۔ جتنے قصے اور فسانے دیہاتوں میں بھولے بھٹکے یاد رہ گئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور سب کی تان اہیروں کی تعریف پر ٹوٹتی ہے۔ اِسکا سلسلہ مہینوں جاری رہ سکتا ہے۔ اس لئے جب جناتیوں نے ”لُرکی“ چھیڑی، تو رام دلارے مُسکرانے لگا، وہ جانتا تھا کہ حریف نے ”برہے“ میں شکست کھانے کے بعد باقاعدہ ”پسپائی“ کے لئے یہ صورت نکالی ہے۔ وہ خاموش تو ہو گیا مگر موقع موقع سے اپنے وار سے باز نہ آیا۔ جہاں مقابل چوکا یا کوئی ”کڑی“ بھول کے اٹکا، اُس نے فوراً ”تصحیح کر دی یا لقمہ دے دیا۔ غرض ”لُرکی“ میں بھی جیت کا سہرا اُسی کے سر رہا اور جناتی کئی محاذ پر شکست کھانے کی وجہ سے جھلانے لگے۔

جب دولھا کے باپ نے دیکھا کہ جناتیوں کے تیور اچھے نہیں ہیں، رنگ میں بھنگ ہونے والا ہے تو اُس نے اپنے ہفتاد سالہ تجربے سے کام لیا اور اپنے ساتھی نوجوانوں کو سمجھایا کہ رات زیادہ آئی، تھوڑی دیر سب لوگ سو رہیں، پھر صبح مقابلہ ہو رہیگا۔ بارے سب نے اسکا کہنا مان لیا۔ چلمیں بھری

گئیں، "اُکڑوں بیٹھ کے، ہاتھ کا چونگا بنا کے، اور اُس میں چلم رکھ کے سب نے دو دو چار چار لمبے لمبے "کش مارے"۔ اور وہیں درختوں کے نیچے، تاروں کی چھاؤں میں "انگوچھا بچھا بچھا کے لمبی تانی"۔ جاگا ہوا فتنہ یوں تھوڑی دیر کے لئے سو گیا۔

صبح سویرے ہی گاؤں میں شب کے مقابلے اور گاؤں والوں کی شکست کی خبر گرمیوں کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر شخص چمار ہو یا پاسی، شیخ ہو یا برہمن، پرجا ہو یا زمیندار، اپنی اپنی جگہ بل کھانے لگا۔ گاؤں کی عزت کا ہر ایک کو خیال تھا۔ یہ ناک کٹنے والی بات ہی تھی کہ چار کوس سے برات آئے اور چھپیدی پور والوں کو ہر بات میں ہرا کے چلی جائے۔ رام دلارے کھانے میں بھی جیتے اور گانے میں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ "جگ ہنسائی نہیں سہی جاتی تھی"۔ اسی لئے اس "دسوماں" کو نیچا دکھانے اور اپنے یہاں کے امیروں کا دل بڑھانے کے لئے ہر فرقے اور پیشے کا آدمی باغ میں آ کے جمع ہو گیا۔

وہاں وقتی اکھاڑہ کھودا گیا تھا، جناتی اور براتی بل جل کے ورزش کرنے والے تھے، کوئی لنگوٹ کس رہا تھا، کوئی جانگھیا پہن رہا تھا، کسی نے ایک معمولی سی چیٹ سے ستر پوشی کر لی، اور کسی نے لنگی ہی کا "کاچھا" باندھ لیا۔ جوان ڈنڈ، بیٹھک، سپاٹے میں مشغول ہوئے۔ لونڈے اپنی کسرت کے کرتب دکھانے لگے۔ ان میں سے کوئی چند قدم دوڑ کے آتا اور بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر

ٹیک لگا کے ایک ساتھ کئی کئی قلابازیاں اس صفائی سے کھاتا کہ سوائے متھیلیوں اور پنجوں کے کوئی حصۂ جسم خاک سے مَس نہ ہوتا۔ کوئی دوڑ کے زمین سے ڈیڑھ دو گز بلند اُچکتا اور ہوا میں گرہ لگاتا، کوئی لاٹھی کے سہارے بہت لمبا اور بلند پھاندتا، اور کوئی "جٹھرا" ایسے صحیح نشانے سے پھینکتا کہ درخت کی جو سبز پتی تاکتا وہی ٹوٹ کے زمین پر گرتی اور دوسروں پر "ریپ" تک نہ آتا۔

رام دلارے بھی انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا اور لنگوٹ باندھ کے اکھاڑے میں اُتر گیا۔ پہلے اُس نے شانوں اور گردن پر مٹی لگائی، پھر ڈنڈ کرنے شروع کئے۔ جب اُنکی تعداد دو ڈھائی سَو سے زائد ہو چکی تو وہ بیٹھک اور سپاٹا لگانے لگا جب اُن کے اعداد بھی ڈنڈ کے قریب قریب پہونچ گئے تو وہ مگدروں کی اُس جوڑی کی طرف متوجہ ہوا، جسے چھیدی پور میں دو ہی ایک آدمی اُٹھا سکتے تھے اور جو محض قوت کی آزمائش ہی کے لئے بنوائی گئی تھی۔ رام دلارے اس جوڑی کو آدھ گھنٹے تک طرح طرح سے ہلاتا رہا۔ پھر براتیوں کے اصرار سے اُس نے دس بارہ نوجوانوں کو زور کرایا اور اکھاڑے میں قدم گاڑ کے مبارز طلب نگاہوں سے جناتیوں کو دیکھنے لگا۔ چھیدی پور والوں میں سے دو تین جوان جنھیں اپنے ورزشی جسم اور داؤ پیچ پر گھمنڈ تھا مقابلے کے لئے اکھاڑے میں اُترنے کا قصد رکھتے تھے، مگر رام دلارے کی ورزش اور قوت کا حال دیکھ کے خاموش ہو رہے۔

رام دلارے اور اُسکے ساتھی جب اکھاڑے سے نکلے تو جناتیوں نے

تازے تازے دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں اور ایک جھوا بھر بھیگا ہوا چنا لاکے رکھ دیا۔ ہر ایک چنا "چابنے" لگا۔ رام دلارے بھی ٹہل ٹہل کے جسم سُکھاتا اور چنا کھاتا رہا۔ جب جسم خشک ہو گیا تو وہ ایک پوری بالٹی دودھ پی گیا اور کپڑے پہن کے ایک درخت کے تنے سے سہارا لگا کے زمین پر بیٹھ گیا اور لڑکوں کی اُچک پھاند دیکھنے لگا۔

مگر اہیروں کی برات میں اُنکا ہیرو نچلا نہیں بیٹھ سکتا، یہ بات لڑکے والوں کو بھاتی ہے اور نہ تماشائیوں کو۔ براتیوں کو یہ کد ہوتی ہے کہ جناتی کسی بات میں نہ جیتنے پائیں۔ جناتیوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ ان کو کسی نہ کسی مقابلے میں تو ہرانا ہی چاہیئے۔ اِس لئے اس موقع پر بھی اب اصرار شروع ہوا کہ ناچ میں مقابلہ ہونا چاہیئے۔ رام دلارے اِس فن میں بھی براتیوں کی نظر میں یگانۂ روزگار تھا، اب اس سے بہتر موقع اس "کرتب" کے دکھانے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ قریب قریب گاؤں بھر جمع تھا، "سب اِس ہیرے کے گُن دیکھنے آئے تھے"۔ بھلا یہ وقت خاموشی کا تھا؟ رام دلارے باوجود شدید اصرار کے پہلے تو ٹالتا رہا مگر جب اہیر ٹولی سے اہیرنوں نے اپنے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کے طعنے دینا شروع کئے اور دو ایک ناچنے تھرکنے بھی لگیں تو اُسے بھی جوش آگیا اور وہ اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی ابتدا اس نے بھجن والے برہے سے کی۔

رام[لہ] رام کی بھجن کرو، رام پر دھرو دھیان
محرم ہووے وہی پہچانے، ایسا دیس ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے پیرن ہو میٹھے، گھُنگھُن چھُن سے نیارا ہے
جات برن پوچھے نا کوئی، پوچھت نا گھر بھوارا ہے
جلک بوند گرے جل ہی ماں، نا میٹھا نا کھارا ہے
سندر مدل بیچ نوبت باجے، مُرلی بین ستارا ہے
محرم ہووے وہی پہچانے، ایسا دیس ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو - رام پر کرو دھیان!

مگر جوں جوں جوش بڑھتا گیا اور اہیرنوں کی طرف سے جواب ملتا گیا، وہ فی البدیہہ برجستہ موزوں کرتا گیا۔ ہر ہر بے کے بعد وہ اہیروں کا ناچ ناچتا تھا۔ کبھی کمر پر

لہ رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محارم اسرار کے کوئی نہیں جانتا۔ ہم (اس دنیا میں) جہاں جاتے ہیں اجنبی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ہم سے ہماری ذات کی بابت دریافت کرتا ہے اور نہ کوئی ہمارا وطن پوچھتا ہے۔ (حقیقت یہ ہے) کہ ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محارم اسرار کے اور کوئی نہیں جانتا۔ جب پانی کی بوند پانی ہی میں مل جاتی ہے تو اُسکے ذائقے میں کوئی فرق نہیں ہو جاتا۔ اور جب مختلف باجے ایک ساتھ بجتے ہیں تو اُنکی آوازوں میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محارم کے کوئی نہیں بتا سکتا، اس لئے بس رام رام کرو اور اُسی کا دھیان رکھو۔

دونوں ہاتھ رکھ کے محض سر و سینہ زور زور سے ہلاتا تھا، کبھی صرف کولہے اور کمر کو حرکت دیتا تھا اور کبھی ایک پاؤں کی ایڑی پر لٹو کی طرح بڑی تیزی سے گھومتا تھا۔

اہیرنیں بھی ہاتھ چمکا کے اور گالیاں دے دیکے ناچتی تھیں، اور ہر ہر ہے کا جواب گیت سے دیتی تھیں، مگر کیلے کے درختوں میں کھجور کے پیڑ کی مضبوطی کہاں؟ جہاں سخت جھونکے آئے اور وہ دُہرے ہو گئے!

جب اہیرنوں نے دیکھا کہ اُن کے یہاں گیتوں اور گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو چلا ہے، اور بیاہ کا سارا کام مقابلے کی وجہ سے بند ہوا چاہتا ہے تو اُن میں سے دو تین دَوڑی ہوئی نولاکھی کے پاس پہونچیں۔ اُس نے عمر کی صرف اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں کہ اچانک گرفتارِ خزاں ہو گئی تھی۔ جوان شوہر گونا کراتے ہی سُرگ باسن ہو گیا تھا، وہ اب بیوہ تھی، نہ اُسکی مانگ میں "سیندور" تھا، نہ ہاتھوں میں چوڑیاں اور نہ بر میں رنگین ساری۔ اس کے لئے تو اب گھر کا ایک کونا تھا، خاموشی تھی اور سپید کپڑے۔ وہ بیاہ برات میں کیا مُنہ لے کے جاتی۔ ایسے گھر میں تو اس کی موجودگی ہی بدشگونی کے لئے کافی سمجھی جاتی۔

مگر سکھیاں بھلا اس وقت ان باتوں کو کہاں دھیان میں لاتی تھیں۔ گاؤں بھر کی ناک کٹ رہی تھی۔ رام دلارے ہر بات میں جیتتا چلا جا رہا تھا۔ اہیر اسکے مقابلے سے عاجز آ چکے تھے، اب کیا اہیرنیں بھی اپنے مردوں کی طرح کم ہمت تھیں کہ "ہاتھ پاؤں ڈال کے بیٹھ رہتیں"۔ نولاکھی ناچنے گانے کی ماہر تھی،

جوان تھی، بال بچّوں والی نہ تھی، شادی بیاہ کا اُسے کام کاج نہ کرنا تھا، اِس سے زیادہ اس مقابلے کے لئے کوئی موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ بس سب مل کے اُسے کھینچ لائیں۔

نولاکھی کو پس و پیش اِس لئے تھا کہ اسکی بیوگی کے زمانے میں اُس کے پاس بہت سے منچلے امیروں کی طرح رام دلارے کا بھی پیغام آچکا تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ کُشتی اور پہلوانی کی طرح ناچنے گانے میں بھی مشاق ہے۔ شب سے وہ اسکا تذکرہ سُن سُن کر اسکی جھلک دیکھنے کے لئے بیچین بھی ہو رہی تھی۔ اسکا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ وہ رام دلارے کو اس مقابلے میں ہرا کے یہ دکھا دے کہ اسکا "حوصلہ کرنا" ہر ایک کا کام نہیں۔ مگر جتنی رام دلارے تک پہونچنے اور اسکے مقابلے کی خواہش بڑھتی، اُتنی ہی شرم بھی بڑھتی تھی۔ وہ اسی "ہیس میں" میں تھی کہ سکھیوں نے زبردستی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اور وہ دل ہی دل میں، جھیپتی، شرماتی، نظریں نیچی کئے چلی۔

آموں کے باغ کے پاس پہونچ کر اس نے پہلی بار مقابل پر نظر ڈالی، دیکھا ایک جوان کھڑا ہے۔ گندمی رنگ، گول چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، کانوں میں موٹی موٹی "مُرکیاں"، گلے میں اشرفیوں کا کنٹھا، سانڈ کا سا سینہ، "باگھ" کی سی کمر، ساری سج دھج پہلوانوں کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دل میں بڑے زور سے چٹکی لی۔ یہ تو مرے ہوئے سوامی سے ملتی جلتی ہوئی صورت تھی!

گھبرا کے جھجکی، مگر سکھیوں نے ڈھکیل کے سب کے آگے کر دیا۔

براتیوں میں سے کئی ایک نولاکھی کو پہچانتے تھے، اُسکے حُسن اور اُسکے ناچ کے اکثر گھائل تھے۔ اِس لئے رام دلارے کے گرد بیٹھے ہوئے مجمع میں ایک اضطرابی لہر سی دَوڑ گئی۔ رام دلارے نے اِس کیفیت کو محسوس کیا اور وہ ناچتے ناچتے ٹھٹھک کے رُک گیا۔ امیروں نے ایک دوسرے کے پہلوؤں میں کہنیاں ماریں اور بولے "اب مکابلہ برابر کا ہوا، رام دلارے ایک ترپھ، نولاکھی دوسری ترپھ!"[1]

رام دلارے نے نولاکھی کا نام سُنتے ہی اسے بغور دیکھا۔ "بادل ماں جیسے چندر ما چمکے" ویسا ہی مَیلی ساری میں اُسکا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس پر آفت "کٹورا ایسی بڑی بڑی مدھ بھری آنکھیں اور ہنس ایسی لمبی اور ٹیڑھی گردن" "سڈول بھرا بھرا جسم، نئے پودے کی طرح نرم نرم ہاتھ پاؤں، پُھرتیلے بچھیڑے کی ایسی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی" "بڑی سُندر جان پڑی" ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے نولاکھی کو دیکھا ہی نہیں، بلکہ ساتھ ہی ساتھ کئی لبریز جام بھی چڑھا لئے۔ اِس لئے کہ وہ اپنے میں عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کر کے ایک پُرانا برہا ناچ ناچ کے گانے لگا۔

---

[1] اب مقابلہ برابر کا ہوا، رام دلارے ایک طرف نولاکھی دوسری طرف۔

ایک[لہ] سمے میں ہری روپ بدل لال، ڈھیلیں بیدا کا بھیس
کھوری کا کھوری گھومے بیدوا، سہر ماں کونو ہو بیماری؟
اپنے[لہ] محل سے نکلن رادھکا، دکھلن بیدا صورت تھاری
آؤ نہ بیدا میری نگریا، پہچانو میری بیماری
نا دیکھوں توری سردی گرمی، نا دیکھوں توری بیچاری
تم ناری اس بھنگ بھئی ہو، بگڑ گئی ہے سب ناری
آؤ نہ بیدا میری نگریا، کھدمت کر بے تھاری
آؤ دیب ہم دھن دولت، اور جاگہ جمیداری

لہ ایک بار کرشن نے بھیس بدلا اور وید بن کے گلی گلی گھومنا اور پکارنا شروع کیا کہ اس شہر میں وئی بیماری تو نہیں ہے؟ (یہ صدا سنتے ہی) رادھا اپنے محل سے نکل پڑیں اور وید کی صورت دیکھ کے پہچان کے بولیں "اے وید جی، ادھر آئیے، ذرا میری بیماری تو پہچانیے"۔ انھوں نے ہا "میں تمھاری بیماری بھلا کیا پہچانوں گا، تم تو خود ایسی آفت روزگار ہو کہ تمھیں دیکھتے ہی یری نبضیں چھوٹی جاتی ہیں"۔ اس پر رادھا بولیں "اچھا میرے پاس تو آئیے، میں آپ کی خدمت کروں گی۔ آپ کو روپیہ پیسہ، جگہ، زمینداری سب کچھ دوں گی۔ گوکل کا راج نذر کروں گی، بس ٹھاٹھ سے بیٹھ کے حکومت کیجیے۔" وید نے جواب دیا "مجھے تمھاری دولت، تمھاری زمینداری، اور تمھارے راج کی خواہش نہیں۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں، سو اگر تم مجھے پنا شوہر بنا لو تو البتہ راضی ہوں!"

اور دیا گوکلا کار جوا ، بیٹھل کریہا بیہاری
نا چاہوں تور دھن دولت ، نا لیبوں تور جگہ جمیداری
نا چاہیں گوکلا کار جوا ، ناہیں کر بنے بیہاری
ہم چاہیں رسوں کا کلیا ، ہم ہی پُرس توں ناری

آخری ٹکڑا " ہم ہی پُرس توں ناری " رام دلارے نے آگے بڑھ کے اور نولاکھی کی طرف اشارہ کر کے اس طرح کولے کو حرکت دے کے گایا کہ سارا مجمع ہنستے ہنستے بیتاب ہو گیا۔ نولاکھی بھی دل ہی دل میں کٹ گئی۔ مگر حریف کے پہلے ہی وار میں جھجک کے پیچھے ہٹ جانا شکست ماننے کا پیش خیمہ تھا۔ اور وہ اس کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے مقابلوں میں "ور" ہی رہی تھی ، اس لئے قبل اسکے کہ رام دلارے کچھ اور کہہ سکے ، اُس نے اس برہے کی آخری کڑی حد درجہ تحقیر آمیز لہجہ میں ہاتھ چمکا کے گا دی۔

"نیا پر چڑھ کے گول کاٹے لا کنھیا آکھر جتیا کا توں اہیرا[1]"

اہیروں اور جناتیوں نے اس حاضر جوابی پر اس زور کا قہقہہ لگایا کہ رام دلارے اور اُسکے ساتھی بالکل ہی جھیپ گئے۔

ناگن نے بیرے کا پہلا وار خالی ہی نہیں دیا بلکہ خود چوٹ کر گئی !۔

---

[1] کنھیا کشتی پر چڑھ کے چکر لگاتے ہو ، یعنی ہر پھر کے اپنے ہی مطلب کی کہتے ہو۔ آخر تم ذات کے اہیر ہی ہونا !

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

گھنٹوں مقابلہ ہوتا رہا۔ دونوں نے اِس قدر برہے اور گیت گائے کہ گلے پڑ گئے۔ اب خاموش ناچ کا جواب ناچ سے دیا جا رہا تھا۔ رام دلارے نے کرتہ اُتار کر پھینک دیا تھا "دھوتی" کا کاچھا کس لیا تھا۔ نولاکھی نے ساری کا آنچل کمر میں لپیٹ لیا تھا اور "پھبتی" لنگی کی طرح یوں کھینچ کر پیچھے کھونس لی تھی کہ گوری گوری پنڈلیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح جھلک رہی تھیں، آنکھیں خون سے بھری کٹوریاں ہو رہی تھیں، ہونٹ بالکل بنفشی تھے، مگر مسکراہٹ سے دانتوں کی بتیسی بار بار چمک اُٹھتی تھی، اور کمر اور کولے کی حرکت برابر مشین کی طرح جاری تھی۔

رام دلارے کو زیادہ تکان نہ تھا، وہ مرد تھا، پہلوان تھا، بن بیاہا تھا، وہ دس بارہ گھنٹے ایک طرح ناچ سکتا تھا۔ مگر مقابل کوئی مرد نہ تھا، ایک نازک اندام سیمتن عورت تھی۔ پھر بھی وہ گھنٹوں سے کھڑی برابر کا مقابلہ کر رہی تھی۔ ہر برہے کے جواب میں کوئی برہا یا گیت گاتی۔ جب تک گلا نہ پڑا تھا، خاموش نہ ہوئی تھی۔ ناچتی بھی اس خوبی اور دلفریبی سے تھی کہ جسم کی ہر حرکت اور اعضا کی ایک ایک جنبش بوڑھے "پھوس" اہیروں کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتی تھی۔ اسکا استقلال یہ بتاتا تھا کہ وہ بات پر جان دیدیگی، مگر ہار نہ مانیگی۔ انداز کہتا تھا کہ تھک کے چور ہو گئی ہے، مگر مسکراہٹ بتاتی تھی

کہ جب تک دم میں دم ہے ناچے جائیگی۔ رام دلارے نادیدہ عاشق تھا، پیغام بھیج چکا تھا، آج اس باہمت مقابلے نے اسکے دل میں وہ جذبۂ ایثار پیدا کر دیا جو وفورِ محبت ہی کے بعد ممکن ہے۔

اس نے دفعتہً انگڑائی لی اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ نولاکھی ناچتے ناچتے گھبرا کے ٹھٹکی، پھر تن کے کھڑی ہو گئی۔ رام دلارے نے اسکے قدموں کی طرف ہاتھ لے جا کے کہا "دیوی جی ہم ہار گئیلیں، تہارا ایسن ناچ اِہ دیس ماں کیہو کا نا آوت!" جناتیوں نے اس پر خوب تالیاں بجائیں اور فقرے کسے، اہیرنوں نے گالیاں دے دیکے "ہارگوا! ہارگوا!" کا شور مچایا، مگر نولاکھی نے رام دلارے پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالی اور سر جھکائے چپکی اپنے جھونپڑے میں چلی گئی۔ نگاہیں کہتی تھیں کہ رام دلارے کی شکست مان لینے نے جیت کو ہار بنا دیا اور ہار کو جیت!۔

سپیرے نے ناگن کو جڑی سنگھا کر مدہوش کر دیا تھا، اب وہ اسکے قابو میں تھی۔

اس واقعے کے پندرھویں دن رام دلارے چھیدی پور پھر آیا۔ دن بھر اہیر ٹولی میں رہا، شام کو جب رام نگر واپس جانے لگا تو نولاکھی سرخ چادر اوڑھے اسکے پیچھے پیچھے تھی اور سکھیاں بابل گا رہی تھیں۔ مگر رام دلارے کا انداز ہی

لے دیوی میں ہار گیا، تمہارا سا ناچ اِس ملک میں کسی کو نہیں آتا۔

نرالا تھا، وہ بائیں کاندھے پر لاٹھی رکھے اُسے اُلٹے ہاتھ سے سنبھالے تھا،
اور داہنا ہاتھ کبھی کان پر، کبھی کمر پر رکھتا اور مستانہ وار ناچتا اور گاتا جاتا تھا۔

رام رام کی بھجن کرو ، رام پر دھرو دھیان
محرم ہوے وہی پہچانے، ایسا جوڑ ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے اپنی موہنی مٹھے، ایسا موہن پیارا ہے
انکھیاں اِہ کی کھنجر ایسی، چلیا اِہ کی دھارا ہے
دیکھو پنچو ادھر دیکھو ، ای ہی ہمرا پیارا ہے
اِہی سے ہار کے اِہ کے جیتا، اِہی ہے گھات کٹارا ہے
ایسی گھتیا نا کوئی جانے، جانے رام دلارا ہے
محرم ہوے وہی پہچانے ، ایسا جوڑ ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو ، رام پر دھرو دھیان

لہ رام رام کرو اور اُسی کا دھیان رکھو، میرے کفو کو سوائے خاص خاص لوگوں کے ہر ایک نہیں پہچان سکتا۔ وہ جہاں جاتی ہے اپنی موہنی اور پیاری صورت کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اُسکی آنکھیں خنجر ہیں، اُسکی چال میں دریا کی روانی ہے۔ اے پنچو ادھر دیکھو، یہی میری پیاری ہے۔ اِسی نے ہار کے میں نے اسے جیت لیا۔ یہی ترکیب سب سے زیادہ کارگر تھی۔ ایسی چالیں سوائے رام دلارے کے دوسروں کو نہیں آتیں۔ (یہی تو وجہ ہے کہ) میرے کفو کو بھی سوائے مخصوص لوگوں کے ہر کس و ناکس نہیں پہچان سکتا۔ (اور اسی لئے فرض ہے کہ) رام رام کرو اور اسی کا دھیان کرو۔

وہ ہر کڑی پر رُک کے کھڑا ہو جاتا، کولھے اور کمر کو حرکت دیتا، پھر ناچتا ہوا نولاکھی کے گرد گھومتا اور آگے بڑھتا۔ نولاکھی شرماتی، لجاتی، بدن چُراتی، مگر گھونگھٹ سے "تیر نیم کش" مارنے سے باز نہ آتی تھی۔

ہاں ہاں، پیپرے کے منتروں نے ناگن کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ اب اسکے گلے کا ہار تھی!

سنہ ۱۹۳۳ء

باغی کی بیوی

ان دنوں رادھا کے لیے کچھ کم تکلیفیں نہ تھیں۔ ڈیڑھ دو سو روپے مہینے خرچ کرنے کی جگہ وہ آج کل پیسے پیسے کو محتاج تھی۔ بچوں کے کپڑے پلے، چکٹ ہو ہو کے پھٹ چکے تھے۔ انھیں رات دن رفو کرتے کرتے اور گھر پر ھوتے دھوتے اسکے نازک ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ برتن باسن مانجنے ے لئے بوڑھی مہری جو میکے سے ساتھ آئی تھی اب بھی موجود تھی، اور مہینوں سے لکل مفت کام کر رہی تھی۔ پھر بھی رادھا کا ضمیر اس سے یوں مفت کام لینے پر امت کرتا۔ وہ اس لئے "چوکا برتن کرنے میں" مہری کی برابر شریک رہتی۔ رض صبح چار بجے سے رات کے گیارہ بجے تک دم مارنے کی فرصت نہ ملتی۔ دکے بچے کی خدمت کر لیتی تو بڑا اٹھتا۔ تھا تو وہ تین ہی برس کا۔ مگر ماں کے تانے میں چھوٹے کا مقابلہ کرتا۔ اگر وہ گود میں ہوتا تو یہ بھی گود چڑھنے ے لئے رو رو کر جان دیتا۔ اکیلی رادھا، کس کس کو سنبھالے۔ پھر گھر کا کام کاج

پیسہ نہ ہونے پر ہر صبح اسکی فکر کہ آج آٹا کہاں سے آئے اور بنیے کو قرض دینے پر کس طرح راضی کیا جائے۔ ترکاری والے نے کل مہری کو بُرا بھلا کہا تھا کہ اب بغیر پیسہ لئے ہوئے دوکان پر نہ آنا۔ پیسہ کہاں سے اور کس سے منگایا جائے۔ کون سی چیز رہن رکھی جائے۔ کون سا گہنا بیچا جائے۔ رادھا یہ سب باتیں انگیز کر رہی تھی۔ ہندوستان کی عورتوں کو آئے دن یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ صدیوں سے اُنکی یہی زندگی ہو رہی ہے۔ رادھا گو بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ مگر اسکی رگوں میں بیسیوں ایسی بیویوں کا خون تھا جنھیں یہ سب جھیلنا پڑا تھا۔ اسکا شوہر مہیشور چھ مہینے سے پٹنہ میں بیکار پڑا تھا۔ ریلوے کی ملازمت اس نے اسٹرائک کے سلسلے میں کھو دی تھی۔ دو چار مہینے تو گھر کا اندوختہ خرچ ہوتا رہا۔ اب بالکل ہی ہاتھ خالی ہو گیا تھا، پھر بھی رادھا ہمت نہ ہاری تھی۔ وہ شوہر کی اطاعت، بچوں کی خدمت اور گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسکا بھی دن پھر جائیگا۔ وہ اسی روز کی منتظر ساری تکلیفیں برداشت کر رہی تھی۔ مگر شوہر کی حرکتوں نے اُسے حد درجہ پریشان کر دیا تھا۔ وہ ادھر ایک مہینے سے دن میں گھر سے باہر ہی نہ نکلتا تھا۔ البتہ شام ہوتے ہی چلا جاتا، اور کبھی بارہ بجے، کبھی ایک بجے گھر پلٹتا۔ اُسکے چہرے سے پریشانی اور فکر کی جگہ اب وحشت کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ وہ دن رات کچھ سوچا کرتا اور آہستہ آہستہ اپنے سے باتیں کرتا تھا۔ رادھا نے دو چار روز تو خاموشی سے یہ حالت دیکھی۔ پھر ایک روز پوچھ بیٹھی کہ کیا

معاملہ ہے تم روزانہ شام کو کہاں جاتے ہو اور اتنی دیر تک کہاں رہتے ہو!

مہیشور نے یہ کہہ کے بات ٹال دی کہ "کچھ نہیں ایک صاحب ریلوے کے افسر ہیں اُن سے کچھ کام بننے کی امید ہے، اُنھیں کے یہاں جاتا ہوں"۔ رادھا بھی خاموش ہو رہی، مگر جب اُس نے روز بروز شوہر کی وحشت میں اضافہ ہوتے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ وہ بڑے کام کے لئے تیار ہو رہا ہے تو اس نے چپکے چپکے اسکے تمام حرکات و سکنات کو دیکھنا شروع کیا۔

مہیشور کا دماغی ہیجان ہر روز بڑھتا ہی جاتا تھا، وہ سوچتے سوچتے کبھی ہنس پڑتا تھا۔ کبھی ایک لمبی سانس اس طرح لیتا تھا کہ سیٹی کی سی آواز منہ سے نکل جاتی۔ کبھی سر ہلا کے خود ہی خود کہتا "ایسوں کی یہی سزا ہے!"

وہ جب اِس طرح سوچتا ہوتا تو اگر بڑا یا چھوٹا کوئی بچہ روتا تو اُس کی آنکھیں غصے سے چمکنے لگتیں، وہ دانت پیس کے کہتا "چُپ بے کمبخت، نہیں تو گلا گھونٹ دونگا"۔ پھر خود ہی چیخ اُٹھتا۔ "بھگوان ایسے وقت ان بچوں ہی کے دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

رادھا مہیشور کی ان حرکتوں کو دیکھتی اور ان باتوں کو سنتی اور اسکا دل بلیوں اُچھلنے لگتا۔ وہ شوہر پر اپنے خوف کو ظاہر نہ ہونے دیتی، مگر دل ہی دل میں اس ڈر سے کانپتی ہوتی کہ کہیں سوامی کا دماغ نہ خراب ہو جائے۔ کہیں وہ ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ روپیوں پیسوں اور نوکری کے ساتھ ساتھ لعل

سی جان بھی ہاتھ سے جائے۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل کے زمانے میں اس شوہر کی طرح کے سیکڑوں نوجوان بیکار ہیں اور ہر ایک اپنی جان سے اور دُنیا سے خفا ہے۔ ہر ایک خطرناک سے خطرناک حرکت کرنے کے لئے تیار ہے۔ مہیشور کی ایسے ہی لوگوں سے دوستی ہے۔ اسے لوگ بہکا کر ہر طرح کے کام کے لئے تیار کر سکتے ہیں۔ اس نے اسی لئے اپنے دل میں یہ طے کر لیا کہ وہ عمر میں پہلی دفعہ سمجھانے بجھانے کی کوشش کریگی۔ اس نے اسی لئے ایک رات کو جب مہیشور ایک بجے رات کو مکان پلٹا تو ڈرتے ڈرتے کہا "یہ آدھی رات تک گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں ہے۔" مہیشور نے اسے غصے سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ رادھا شوہر کی تیکھی چتون سے سہم ضرور گئی، مگر اس نے پھر دل کڑا کر کے سوال کیا "اگر رات کی جگہ دن میں باہر جایا کرو تو کیا ہرج ہے؟"

مہیشور نے توڑا ہوا نوالا تھالی میں رکھدیا۔ غصے سے بولا "تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں دن میں بھی گھر میں نہ رہوں؟"

رادھا نے شوہر کو خوشامدانہ انداز سے دیکھا وہ بولی "میں یہ نہیں کہتی، مگر کام کاج کرنے یا گھومنے پھرنے کا وقت دن ہے، یا رات میں آٹھ نو بجے تک روزانہ دن بھر گھر میں رہنا اور پھر رات کو ایک ایک بجے تک گھومتے رہنا تو کچھ اچھا نہیں۔"

مہیشور نے تھالی کو ٹھوکر ماری اور چوکے سے اُٹھ گیا۔ "سچ ہے ایسی

زندگی سے موت بھلی ہے! خود اپنی بیوی بھی مرد کی اسی وقت تک عزت کرتی ہے جب تک جیب میں پیسے ہوں!"۔ رادھا نے چاہا کہ اسے روک لے مگر اس نے اُسے اس طرح جھٹک دیا کہ وہ منھ کے بل گرتے گرتے بچی۔ مہیشور تو منھ لپیٹ کے سو رہا، مگر رادھا رات بھر اپنی قسمت اور شوہر کی حالت پر روتی رہی۔

صبح سویرے ہی مہیشور اُٹھ کے باہر چل دیا۔ دن بھر نہ آیا۔ رات کے کوئی بارہ بجے آیا اور کھانا مانگا۔ بوڑھی ماں اور بچے سو چکے تھے، مگر رادھا چولھے کے پاس کھانا لیے بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی روٹی، دال اور بھاجی لاکے رکھدی۔ مہیشور نے کوٹ نہ اُتارا بلکہ سارے کپڑے پہنے جوتا اُتار کے چوکے میں بیٹھ گیا، اور اس انداز سے کھانا شروع کیا جیسے اُسے کسی مہم پر جانا ہے۔ اس نے جلدی جلدی دو چار نوالے حلق سے اُتارے اور پانی پی کے چوکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ رادھا کو کل کا تلخ تجربہ تھا، اس نے آج ہاتھ تو نہ پکڑا مگر اتنا پوچھا ضرور کہ "کیا ہے؟ کاہے کی جلدی ہے؟"

مہیشور نے کہا "کچھ نہیں، مَیں ابھی باہر جاؤنگا"۔ رادھا گھبرا گئی، شوہر کی خفگی کا ڈر اسکے کسی خطرے میں پڑنے کے خوف کے سامنے بھول گیا۔ وہ جلدی سے ہاتھ پکڑ کے بولی "اتنی رات کو تو میں اب باہر نہ جانے دونگی!" مہیشور نے زہر خندہ کیا۔ پھر وہ بولا "آج مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ آج مَیں اپنے دشمنوں سے بدلا لینے جا رہا ہوں"۔ اس نے یہ کہہ کے رادھا کا

ہاتھ چھڑانا چاہا۔ اُس نے گرفت اور مضبوط کی ہی تھی کہ چھوٹا بچہ رونے لگا۔ مہیشور نے کہا "جاؤ دیکھو بھیا رو رہا ہے اسے چُپ کرا کے آؤ تو مجھ سے باتیں کرو۔" رادھا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ اُدھر مُڑ گئی جدھر اسکا چھوٹا لخت جگر پلنگ پر تنہا پڑا رو رہا تھا۔ مہیشور نے اِس جذبۂ مادرانہ سے فائدہ اُٹھایا اور ہاتھ چھڑا کے گھر کے باہر ہو گیا۔ رادھا کا پچھلا خوف عود کر آیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ سوامی آج جان دینے اور جان لینے جا رہا ہے۔ اس نے لپک کے چھوٹے بچے کو گود میں اُٹھایا اور اسے لئے ہوئے شوہر کے پیچھے لپکی۔ اندھیری رات تھی، بادل گھر کے آ گئے تھے، گلیاں سائیں سائیں کر رہی تھیں شوہر کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی، مگر وہ محض پاؤں کی آہٹ لیتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ شوہر اس طرف جا رہا تھا جدھر ریلوے لائن تھی۔ ان کا گھر کچھ دُور نہ تھا۔ وہ ان راستوں سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسکے دل میں معاً یہ خیال آیا کہ آج یقینی کچھ ریلوے ہی کے متعلق ہنگامہ ہونے والا ہے۔ اِس نے سُنا تھا کہ آج کل ریلوے لائن اور پٹریوں پر باغیوں کا حملہ ہے۔ اُنھوں نے ٹرینوں کا لڑا دینا، اُلٹ دینا سوراج حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسکا شوہر بھی اسی حماقت میں گرفتار ہے۔ اس نے اپنے قدم اور تیز کیے۔ مگر کچھ دُور چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ جیسے مہیشور زمین میں سما گیا۔ اسکے پاؤں کی آہٹ بالکل نہ سُنائی دی، اسے یاد آیا کہ وہ چند

قدم پیچھے ایک ایسی گلی چھوڑ آئی ہے جو ذرا گھماؤ سے ریل کے چھوٹے پل کے
پاس نکلتی ہے۔ پھر وہ پلٹی اور اسی گلی میں گھسی۔ گلی حد درجہ تنگ و تاریک
تھی۔ بارہ بج چکے تھے، گھروں کے دروازے بند تھے، نہ کسی کے بولنے کی آواز
نہ کسی کے جاگنے کی آہٹ ملتی تھی۔ اسکا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ ایک نازک
بدن کمزور عورت تھی، اس نے بچے کو سینے سے قدرے زور سے لگا لیا۔ وہ معصوم
سو رہا تھا مگر رادھا کے لئے اتنا سہارا ہی بہت تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے
اسکے سینے سے ایک ایسا جوشن لگا ہے اور اسکے گلے میں ایک ایسا تعویذ ہے کہ
دنیا کی آفتیں اس سے ٹل جائینگی۔ وہ اسی طرح ڈرتی سہمتی بچے کو گلے سے
لگائے پل تک پہونچی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے ریلوے پل کی دونوں جانب
دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ جانتی تھی کہ آج کل ریلوے لائن پر برابر پولیس کا
پہرا رہتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے شوہر کو پکارا نہیں۔ اسکے دل میں یہ ڈر
سمایا ہوا تھا کہ مہیشور باغیوں کا ضرور شریک ہے۔ اور اسکے پاس ٹیر ہانی کھانے
کے ہتھیار یقینی ہیں۔ اس نے کھانا کھلاتے وقت دیکھا تھا کہ اسکے کوٹ کی جیبیں
بھری ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ پل کے پاس پہونچ کے یہ سوچتی رہی کہ وہ اب کیا
کرے۔ شوہر کی تلاش کے لئے وہ کس طرف جائے۔ وہ اس جانب مڑ پڑی جدھر
اسٹیشن تھا۔ اسے دفعتاً یہ بھی یاد آگیا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں بمبئی پشاور ایکسپرس
آتا ہوگا۔ وہ پنجاب میل کی رفتار سے چلتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جلدی

جلدی قدم رکھنا شروع کئے۔ اسے اسٹیشن پہونچکر کسی طرح اکسپریس رکوانا چاہیے
سیکڑوں بے قصوروں کی موت مہیشور کی چھ مہینے کی بیکاری کا بدلہ نہیں ہو سکتی
ہے۔ اس میں کمپنی یا انگریزوں کا کیا نقصان ہے۔ ان کی چھ گاڑیاں ٹوٹ
جائینگی۔ مگر جانیں تو جائینگی ہندوستانیوں کی۔ پچاسوں عورتیں بیوہ ہو جائینگی۔
سیکڑوں بچے یتیم ہو جائینگے۔ اسکے قدم اور جلدی جلدی پڑنے لگے۔ اسکا دم پھولنے
لگا۔ اسکے مُنھ سے "ہے بھگوان! ہے بھگوان!" کی ندا برابر نکل رہی تھی۔ وہ
بچے کو کبھی داہنے کندھے سے لگاتی کبھی بائیں سے، کبھی ٹھوکر کھاتی، کبھی پھسل
جاتی۔ مگر برابر اسٹیشن کی طرف بڑھتی جاتی۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کی ٹٹماتی ہوئی
روشنی دکھائی دینے لگی۔ اسکے دماغ سے شوہر کا خیال جاتا رہا تھا، بس کئی سو
عورتوں کو بیوہ ہونے اور کئی سو بچوں کو یتیم ہونے سے بچانے کا خیال اُسکے دل میں
بسا تھا کہ دفعتاً فاصلے والے سگنل کے پاس پہونچ کے وہ رُکی۔ مہیشور آخر کہاں
ہے؟ کہیں وہ پُل کی دوسری جانب تو نہیں ہے؟ وہ گھبرا کے وہیں بیٹھ گئی
سوچنے لگی مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ سوامی کو پہلے بچانا چاہیئے۔ اسٹیشن پر اگر جا کے
کہتی ہوں تو سب پوچھیں گے تجھے کیونکر معلوم ہوا، پھر سوامی دھر لئے جائیں گے
پھانسی ہوگی یا کالے پانی بھیج دیے جائینگے۔ میرے بچے مر ہی جائینگے! ہائے
رام کیا کروں؟" وہ پھر اٹھی اور اب اس طرف دوڑ کے چلنے لگی جدھر سے ابھی
آئی تھی۔ تھک گئی تھی، بچہ گود میں لیے ہوئے چلنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر ادھر

مہینوں سے ہر روز آدھا پیٹ کھایا تھا۔ اپنا حصہ بچوں اور سوامی کو کھلا دیا تھا۔ پھر ساری فکریں۔ حد درجہ کمزور تھی۔ کب کی تھک کے بیٹھ گئی ہوتی۔ مگر اس وقت قوت ارادی نے اعضا کو بالکل ہی محکوم کر لیا تھا۔ اپنی بساط سے زائد کام کر رہے تھے۔ وہ یوں ہی گرتی پڑتی پل تک پہونچی۔ ایک شخص پٹری کے قریب بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ رادھا نے پکارا "کون سوا....." مگر قبل اس کے کہ پورا لفظ منہ سے نکلے، مہیشور نے جیب سے ریوالور نکال کے فیر کر دیا۔ گولی بائیں پہلو پر لگی۔ بچہ داہنے پہلو پر اس وقت تھا وہ بچ گیا۔ مگر رادھا کے کاری زخم آیا وہ ایک سکنڈ تک جھوم کے وہیں گر پڑی۔

مہیشور نے کراہنے کی آواز سے محسوس کیا کہ زخمی کوئی مرد نہیں بلکہ عورت ہے، اور وہ گھبرا کے پل سے کود کے رادھا کے پاس آیا۔ رادھا کی گود سے بچہ اب تک نہ چھوٹا تھا۔ اس نے شوہر کو قریب دیکھ کے اب اسے چھوڑ دیا۔ بچہ اس پتھریلی سڑک پر گر کے رونے لگا۔ مہیشور "ہائے بھگوان رادھا!" کہہ کے بیوی کے قدموں کے پاس گر پڑا۔ اور ریوالور اپنے سر کے قریب لے جا کے گھوڑا دبانا ہی چاہتا تھا کہ رادھا نے ہاتھ پکڑ لیا۔ رک رک کے بولی "دیکھو پولس ——— کی سیٹی بج رہی ہے ——— آتی ہی ہوگی ——— اپنی جان ——— مت دو ——— میرے بچے ——— پالنے ہیں ——— کہ دنیا ——— مجھے ——— باغیوں نے

مارا ہے ـــــ ریوالور پھینک دو ـــــ"

مہیشور نے کہا "میں تمھیں مارنے کے بعد جیوں ـــــ ناممکن ہے"

رادھا نے مہیشور کا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھوں سے پکڑ کے کہا "مجھے

اپنے ـــــ مرنے کا رنج نہیں ـــــ استری کے لئے ـــــ

سوامی کے ہاتھ سے ـــــ مارا جانا سورگ ہے۔ ـــــ پر میرے

بالک اب ـــــ تم کو پالنا ـــــ پڑیگا"

اور اس نے مہیشور کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ اور اُس کا ہاتھ

بچے کے سر پر رکھ دیا ـــــ"

مہیشور بیوی اور بچے کے درمیان غش کھا کے گر پڑا۔

سنہ ۱۹۳۴ء

بندوں کی جوڑی

انسپکٹر "ٹم" سے مجھ سے ملاقات کرکٹ فیلڈ اور کھیل کے میدانوں کی تھی، باوجود اسکے کہ وہ گرم ملک میں پیدا ہوے تھے، اور انھوں نے یہاں کی پینتیس چھتیس گرمیاں کاٹی تھیں، مگر وہ اب بھی ضلع بھر میں سب سے تیز دوڑ لیتے، سب سے زیادہ اونچا پھاند لیتے اور ہاکی میں سب سے عمدہ سنٹر فارورڈ کھیل لیتے تھے، پولیس کے لائن انسپکٹر اور اینگلو انڈین ہوتے ہوے بھی وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔ جب شہر میں کوئی میچ ہوتا تو انسپکٹر ٹم یا خود کھیلتے ہوتے، یا رفری کرتے۔ میلے ٹھیلوں میں بھی ٹہلتے دکھائی دیتے اور بیچ تہواروں کے موقع پر بھی، آدمی ہنس مکھ، ملنسار تھے۔ پھر پرتاب گڑھ، چھوٹا سا ضلع۔ ہر گورنمنٹ ملازم یونہی ایک دوسرے سے واقف تھا۔ مجھ سے بھی انسپکٹر سے تعارف ہوا اور ضلع کی کرکٹ ٹیم میں میری شمولیت نے اچھی خاصی ملاقات کرادی۔

اسی لئے جب پرتاب گڑھ سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوتے وقت اسٹیشن پر

یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ لکھنؤ چل رہے ہیں تو قدرے مسرت ہوئی
یہ یقین تھا کہ سفر لطف سے کٹے گا۔ اسٹیشن پر پانیر اخبار بک رہا تھا، میں نے خرید
لیا اور گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے جلدی جلدی سُرخیاں دیکھنا شروع
کیں۔ اطالیہ و حبش کی آئندہ ہونے والی جنگ کے متعلق جو دول عظمیٰ شطرنج
کی چالیں چل رہے تھے اُن کا ذکر تھا، پھر پنجاب و بنگال کے ہنگامہ خیز سیلابوں
کا، اور ہر ہٹلر کے یہودیوں اور کیتھلکوں کے خلاف نئے اقدامات کا۔ میں نے
ان سب کو سرسری طور پر دیکھا۔ مجھے ان سب سے زیادہ انگلستان اور افریقہ
کے پانچویں کرکٹ میچ اور ورجھنگا ٹورنامنٹ میں موہن بگان اور محمڈن اسپورٹنگ
کے مقابلے کی فکر تھی، میں ورق اُلٹ ہی رہا تھا کہ دفعتاً میری نظر "طلاق کی
درخواست" کی سُرخی پر پڑی۔ مجھے عموماً مقدمات سے اور خاص طور سے
طلاق کے مقدمات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اِس لئے کہ یہ اُن تعلقات کی
رُسوائی ہے جو دو انسانوں کو دو شخصیتوں کو ایک بناتے ہیں۔ میری رائے میں
جس قدر کہ شادی میں اعلان و اشتہار کی ضرورت ہے، اسی قدر ہی طلاق میں
خاموشی اور اخفا کی۔ دو ذاتوں میں جو ارتباط و محبت، یکجہتی و خلوص کے
تعلقات قائم کرنا چاہتی تھیں، نہیں نبھ سکی۔ دونوں نے ایک دوسرے
سے کنارہ کشی اختیار کر لی، تراضی طرفین ختم، تعلق ختم۔ اِس میں جھگڑے
ہنگامے، وکیل، بیرسٹر، جج اور قاضی کی کیا ضرورت؟۔

بہرنوع اس دن خلاف معمول میں نے اس سرخی کے نیچے جو کچھ لکھا تھا اس پر بھی نظر ڈالی۔ لکھا تھا:

"پرتاب گڑھ کے ہر دلعزیز لائن انسپکٹر مسٹر ڈبلو، ایچ، ٹم نے عدالت عالیہ الہ آباد میں درخواست دی ہے کہ انھیں اپنی بیوی مسز ایم، ٹی، ٹم کو زناکاری اور بدچلنی کے جرم میں طلاق دینے کی اجازت دی جائے۔"

میں نے گھبرا کر مسٹر ٹم کی طرف دیکھا، وہ سگریٹ پی رہے تھے اور پولیس کی شریر آنکھوں سے کمپارٹمنٹ کے دوسرے مسافروں کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے علاوہ صرف دو آدمی اور بیٹھے تھے، ان میں سے ایک صاحب "برتھ" پر لیٹے ہوئے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ دوسرے صاحب بیٹھے ہوئے سگریٹ پیتے جاتے تھے اور سیٹی بجاتے جاتے تھے۔ میں نے مسٹر ٹم کی طرف اخبار بڑھا کے کہا "آپ نے یہ خبر دیکھی ہے؟"۔

مسٹر ٹم نے میرے ہاتھ سے اخبار لے لیا، طلاق والی خبر پر نظر ڈالی، تھوڑی دیر خاموش سگریٹ پیتے رہے۔ ان کا ہنس مکھ چہرہ اس وقت بالکل سُرخ تھا، انکی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ان کی کنپٹی کے پاس شکنیں پڑ گئی تھیں اور انکے نیچے کا پتلا ہونٹ اس طرح کانپ رہا تھا کہ انکے ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ کا ٹکڑا خود بخود گر گیا۔ انھوں نے اسکی بھی پروا نہ کی۔ وہ غالباً

اپنی بیوی کو مختلف صورتوں میں دیکھ رہے تھے منگیتر کی حیثیت سے، دُلھن کے لباس میں بیوی کی حیثیت سے، مکار عورت کے بھیس میں، ڈونے۔ الی ناگن کی وضع میں، جھوٹی عصمت مآبی، جھوٹی شرم وحیا، جھوٹا پیار! میں نے دیکھا کہ اُنکے چہرے پر اُسی طرح کے تکلیف کے آثار پیدا ہو گئے جو کسی ذبیحہ کے چہرے پر دم توڑتے وقت پائے جاتے ہیں۔ اُنکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

وہ ایک دفعہ میری طرف پلٹ کر بولے "مسٹر نسیم، میں نے یہ حتمی ارادہ کر لیا تھا کہ میں سوائے عدالت کے کہیں اس معاملے کے متعلق زبان کھولونگا، مگر چونکہ آپ سب سے پہلے آدمی میرے جاننے والوں میں ہیں، جو میری درخواست سے باخبر ہو گئے ہیں اور جس نے مجھ سے پوچھنے کی بھی زحمت اُٹھائی ہے اس لئے میں آپ سے بلا کم وکاست واقعات بیان کیے دیتا ہوں۔

انسپکٹر ٹم نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا، میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک سگریٹ نکال کے شکریہ ادا کیا۔ اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر یونہی کھلا سگریٹ کیس ہاتھوں میں لیے رہے، پھر اسے بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ نہ خود سگریٹ نکالی اور نہ مجھے دیا سلائی دی۔ میں نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور سگریٹ جلائی۔ جب سگریٹ کی مہک اُنکے نتھنوں میں پہونچی تو وہ چونکے، اُنھوں نے کہا "معاف کیجیے گا" پھر سگریٹ کیس نکال کے اسمیں سے سگریٹ لی، جلائی اور اسے ہونٹوں میں دبا کے بولے۔

"میں آپ سے عرض نہیں کر سکتا کہ یہ عورت کتنی حسین، کتنی خوبصورت

ہے، اور بظاہر کمتی بھولی ہے۔ آپ اگر اسکے حالات سے واقف نہ ہوں تو صورت دیکھ کے کبھی یہ خیال ہی نہیں کر سکتے کہ اس حُسن کی دیوی، اس مجسم معصومیت کے دل و دماغ میں بھی کوئی بُری بات آسکتی ہے، آنکھیں بڑی بڑی، کشادہ پیشانی، گول چہرہ، پتلے ہونٹ، ہاتھ کی انگلیاں پتلی سڈول۔ اللہ! اللہ! میں نے کتنی مرتبہ ان انگلیوں کا پیار لیا ہے! —— اور سگریٹ فرش پر گرا کر اسے جوتوں سے مسل کر بولے —— پاؤں چھوٹے چھوٹے! بلا کی جامہ زیب!۔

انسپکٹر ٹم ایک بار دانت پیس کر بولے "میں نے پہلے پہل اسے کلکتہ میں دیکھا، بڑے دن کی تعطیل میں حضور وائسرائے کی آمد کے سلسلے میں جہاں صوبے سے پولیس کے خاص خاص لوگ گئے تھے، میں بھی بھیجا گیا تھا، وائسرائے کپ کا دن تھا، بڑے بڑے راجگان، مہاراجگان، رانیاں مہارانیاں، شہزادے شہزادیاں، شریف زادے، شریف زادیاں، غرضکہ ہر طرح کے لوگ چھوٹے بڑے، مرد عورت، سب ہی گھوڑ دوڑ کے میدان میں موجود تھے میں اسٹیڈیم کے باہر کھڑا ہر آنے جانے والے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ یہ اپنی بوڑھی ماں کو سہارا دیے ادھر سے گزرتی دکھائی دی۔ دفعتاً بڑی بی کو چکر آیا، اُس دن ساری پونجی ہار گئی تھیں، دل و دماغ قابو میں نہ تھا، چنانچہ چلتے چلتے لڑکھڑائیں اور وہیں گر پڑیں، میری نظر اس پھول سے چہرے پر نچھاور ہو رہی تھی، میں نے جو یہ حادثہ دیکھا تو جلدی سے دوڑ کے بڑی بی کو اُٹھایا، وہ آدھی سے زیادہ

بیہوش تھیں، اِدھر اُدھر نظر کی۔ قریب ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی، اس میں لے جاکے ڈال دیا۔ مارگریٹ نے مجھے آبدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں نے اس سے گھر کا پتہ پوچھا، اور ٹیکسی والے سے وہاں تک کا کرایہ دریافت کرکے اسکے دام دیدیے اور تاکید کردی کہ وہ انھیں بخیریت گھر پہونچا آئے۔ اور اپنی ڈائری میں انکا پتہ اور ٹیکسی کا نمبر نوٹ کرلیا۔

غرض یہاں سے میرے عشق اور مارگریٹ کی احسانمندی کی ابتدا ہوئی، میں ہز اکسلنسی کے قیام کے سلسلے میں کوئی دس دن وہاں رہا اور اس درمیان میں ہمارے تعلقات محسن و احسانمند سے بڑھ کر عاشق و معشوق کے سے ہوگئے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ چلتے وقت میں نے اُس سے شادی کا وعدہ لیا اور الہ آباد میں رپورٹ دیتا ہوا پرتاب گڑھ واپس آیا۔

یہاں آنے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ مارگریٹ کے بغیر زندگی نہیں بسر کرسکتا۔ نہ کھیل کود میں جی بہلتا تھا اور نہ کام میں دل لگتا تھا، بس ہر لمحہ یہی آرزو کہ کسی طرح اُڑ کے اُسکے پاس پہونچ جاؤں۔ وہ بھی اپنے خطوں میں کچھ اسی طرح کے جذبات کا اظہار کرتی تھی۔ بالآخر کوئی مہینہ ہی بھر بعد میں نے تین مہینے کی چھٹی لی اور کلکتہ پہونچ گیا اور جلد سے جلد لائسنس حاصل کرکے رجسٹرار کے سامنے جاکر مارگریٹ کو بیاہ لایا۔

انسپکٹر تم نے کانپتے ہاتھوں سے پھر جیب سے سگریٹ کیس نکالا، میں نے

جلدی سے دیا سلائی جلا کر دی، اور وہ سگریٹ جلا کے لمبے لمبے کش لیتے رہے پھر بولے۔

"مسٹر نسیم! میں آپ سے دو ڈھائی مہینے کی زندگی کی مسرت، خوشی، اور لذت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مارگریٹ اُن عورتوں میں سے ہے، جو اگر مرد کو خوش کرنے پر آتی ہیں تو حور بہشتی بن جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک معمولی پولیس انسپکٹر نہیں ہوں بلکہ شاید دونوں جہان کا بادشاہ ہوں، مجھے نہ ماضی کی پروا تھی اور نہ مستقبل کا خیال، میں مارگریٹ میں مستغرق تھا، اور وہ ہر لحہ گلے سے لپٹی رہی۔

ہم لوگوں نے پروگرام یہ بنایا تھا کہ شادی کر کے ہم سیدھے ہنگلی چلینگے چنانچہ وہاں پہلے تین دن گزارے، پھر وہاں سے ہم "گیا" پہونچے، وہاں سے پٹنہ، پٹنہ سے بنارس، بنارس سے الہ آباد، الہ آباد سے آگرہ، وہاں سے میرٹھ، پھر کانپور، اور چھٹیوں کے ختم کے قریب لکھنؤ۔ ہر جگہ ہم اوسط درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرتے، شہر کے آثار قدیمہ اور مشہور چیزوں کو دیکھتے اور اپنے آئندہ مستقر کے لئے کوئی نہ کوئی سامان خریدتے۔

جب ہم لکھنؤ پہونچے تو میں نے محسوس کیا کہ میرا سرمایہ قریب ختم تھا، میں نے اِس لئے دل میں یہ طے کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو مارگریٹ کے لئے کوئی نہ کوئی زیور ضرور خریدنا چاہیئے۔ میں اسی لئے ایک دن حضرت گنج اسے وہاں زیورات کی دکان پر یہ کہہ کے لے گیا کہ مجھے ایک دوست کی بیوی کے لئے بُندوں کی جوڑی خریدنا

ہے، زرا تم چل کر پسند کر دو۔ وہ بہت خوش خوش مختلف قیمتوں کے بُندے دکھیتی رہی، اور اپنے ہی کان میں لگا کر آئینہ میں صورت دکھیتی اور سر ہلا کر رکھدیتی۔ بالآخر اسے ایک پلیٹینم کا سادہ بُندہ مگر بہت ہی خوبصورت بنا ہوا پسند آیا۔ دام پوچھنے پر معلوم ہوا خاصا قیمتی ہے، میں نے نہایت ہی خاموشی سے دام دیدئے اور مارگریٹ کو ایک پندرہ روپے کی انگوٹھی دلوا کے دوکان سے چلا ہی تھا کہ دوکاندار نے روکا۔ میں نے پوچھا "کیا ہے بھئی؟"

اُس نے مارگریٹ کی طرف چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا "میم صاحب کو ایک اور چیز دکھادوں تو پھر آپ انھیں لے جائیں"

میں نے کہا "ہمیں اور کچھ نہیں خریدنا ہے"

وہ بولا "جی وہ جلدی میں خریدنے والی چیز بھی نہیں، آپ دیکھ تو لیں"

یہ کہتے کہتے اُس نے ایک مخملی ڈبیہ سیف میں سے نکال کر کھولی، معلوم ہوا جیسے آنکھوں میں بجلی کوند گئی، دیکھا تو بُندوں کی جوڑی تھی۔ بیچ میں ہیرا، دونوں سروں پر زمرد، اور یہ سب اس عمدہ طور پر کاٹے گئے تھے کہ وہ بلا کی چمک پیدا ہو گئی تھی کہ الاماں والحفیظ!۔ مارگریٹ کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی بیتاب ہو گئی۔ اسکی آنکھوں میں وہ چمک پیدا ہو گئی، جو چوروں، ڈاکوؤں اور بخیلوں کی آنکھوں میں روپیوں کا ڈھیر دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے۔ دوکاندار اسکی یہ حالت دیکھتا جاتا تھا اور مُسکراتا جاتا تھا۔ اس طرح مُسکراتا تھا کہ مجھے بُرا معلوم

ہونے لگا اور میں نے مارگریٹ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا "آؤ چلیں"، مگر اس نے نہایت ہی بے پروائی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور ان بندوں کو کانپتے ہاتھوں سے کانوں میں پہنکر قدآدم آئینوں میں، جو دوکان میں چاروں طرف لگے تھے اپنے کو دیکھنے لگی۔ مجھے مارگریٹ کی بیتابی، اور جوہری کی مسکراہٹ اس قدر کھل رہی تھی کہ میں کہہ نہیں سکتا۔ میں نے بڑھتے ہوئے غصے کو روکنے کے لئے اُس سے قیمت پوچھی۔ اُس نے کہا "ڈیڑھ ہزار!"

مارگریٹ کے بڑھتے ہوئے جوش پر پانی پڑ گیا۔ اُس نے خاموشی سے بُندے اُتار کر ڈبے میں رکھدئے، اور گردن جھکا کر میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھکو جتنی اسکی بھپلی بیتابی بُری معلوم ہوئی تھی، اس سے زیادہ اُس مایوسی پر تکلیف ہوئی۔ جی چاہتا تھا اپنے کو بیچ ڈالوں، مگر یہ بُندے خرید کر اسکے کانوں میں پہنا کر پھر ایک بار اسے خوش دیکھ لوں۔ مگر اقتصادیات کے آہنی پنجوں کی گرفت جذبات سے متاثر ہو کر کبھی ڈھیلی نہیں ہوتی، ہمیں بالآخر دکان سے چلا ہی آنا پڑا۔

راستے بھر مارگریٹ سُست رہی۔ میں نے مختلف طرح کی ہنسی مذاق کی باتیں کیں، اور وہ مجھے خوش کرنے کے لئے تھوڑا بہت ہنسی بھی، لیکن وہ پچھلی شگفتگی اور بیساختگی نہ پیدا ہوئی۔ شب کو کھانا کھانے کے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے خرید کردہ بُندے جب اُسکے کانوں میں پہنائے تو وہ بولی "ایں، یہ تو

دوست کی بیوی کے لئے تھے!"

جب میں نے کہا "ہاں لیکن میں ہی آپ اپنا دوست ہوں اور تم اُس دوست کی بیوی!" —— تو وہ بیساختہ میرے گلے سے لپٹ گئی ——

لیکن شب کو جب میں بستر پر پہونچا تو میں نے دیکھا کہ وہ محوِ خواب ہے مگر گالوں پر آنسوؤں کے قطرے ہیں! — میں نے اسے جگایا نہیں، مگر اُسی وقت قسم کھائی کہ خواہ کچھ بھی ہو، میں سال چھ مہینے میں کسی نہ کسی طرح اتنی رقم ضرور جمع کرلونگا کہ اسکے لئے اسکے محبوب بُندے خریدوں!۔

ذرا آپ خیال فرمائیں کہ ایک شخص جو تین سو تنخواہ پاتا ہو اور تقریباً دو سو روپیہ ماہوار غیر شادی شدہ حالت میں خرچ کرتا رہا ہو، اُسکا شادی کے بعد خرچ کتنا بڑھ جائیگا؟ اور اُسکے لئے ڈیڑھ ہزار روپیہ بچا لینا کس قدر دشوار امر ہے؟ لیکن میں نے ہزاروں تکلیفیں برداشت کرکے، اپنا سگریٹ، اپنی شراب اور اپنی دیگر تفریحیں یک لخت ترک کرکے روپیہ جمع کرنا شروع کیا اور اسی کے ساتھ تقریباً ہر مہینے لکھنؤ جاکر اُس دوکان پر اُن بندوں کو دیکھ آتا۔ لیکن تین مہینے کی حد درجہ دماغی و جسمانی تکلیف کے بعد بہ مشکل ڈیڑھ سو روپیہ جمع ہوا، اور وہاں ضرورت تھی ڈیڑھ ہزار کی!۔ اب کیا کیا جائے؟۔ مارگریٹ کے بندے ہمیشہ تو رکھے نہ رہیں گے، جوہری کو کوئی نہ کوئی گاہک تو مل ہی جائیگا۔ اس لئے میں نے جو حرکت اتنے دنوں نہ کی تھی وہ کر ڈالی۔ میں نے ابتدائے ملازمت سے اُس

وقت تک کبھی ظلم نہیں کیا تھا، کبھی بے ایمانی نہیں کی تھی اور کبھی رشوت نہیں لی تھی! مارگریٹ کی خاطر میں نے ضمیر فروشی کی، میں نے ایک جھوٹے مقدمے میں ایک دولتمند آدمی کو پھنسا دیا اور اس سے پورے ڈیڑھ ہزار رشوت لی، میں آپ سے نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ روپے جب تک میری جیب میں رہے کیونکر ڈس رہے تھے۔ میں نے یہ سب مارگرٹ کی خاطر انگیز کیا۔ اور وہیں گاؤں پر جہاں میں تفتیش کے سلسلے میں گیا ہوا تھا میں نے اپنی موٹر سائیکل بجائے پرتاب گڑھ کے سیدھے لکھنؤ کے لئے ہانک دی۔ طے کر لیا تھا کہ مارگریٹ کے لئے آج ہی بندے لے کر آؤں گا۔

میں لکھنؤ کوئی تین بجے پہونچا۔ معلوم ہوا کہ مالک دوکان کسی لیڈی کے ساتھ باہر گئے ہیں۔ میں نے پوچھا مینجر کہاں ہیں، وہ میری صورت دیکھ کے کچھ گھبرا سا گیا۔ میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔ اسے جلدی سے بندوں کی جوڑی کی شناخت بتائی، اس نے سیف کھولا، سارے خانے دیکھ ڈالے، کہیں بندوں کا پتہ نہ تھا، اس نے اپنے ایک ماتحت کو بلایا، اس سے دریافت کیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے مینجر کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ مینجر نے بمشکل ہنسی ضبط کی اور مجھ سے متانت سے کہا "انسپکٹر صاحب وہ بندے تو بک گئے!"

میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کس قدر مایوسی ہوئی۔ تین مہینے سے جس چیز کے لئے رات دن کوشش کی تھی، جسکی وجہ سے بے ایمانی کی، جھوٹ بولا، رشوت لی،

جسکی وجہ سے اس وقت بلا اجازت افسر بالا لکھنؤ بھاگا ہوا آیا تھا، وہ بک گئی۔ اب مارگریٹ کو کیسے مُنہ دکھاؤنگا، اسکے محبوب بندے میں اُسکو کہاں سے لاکر دونگا۔ غرض یہی سوچتا نہایت ہی افسردہ پھر موٹر سائیکل پر بیٹھا اور قریب شام پرتاب گڑھ کے مضافات میں پہونچا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ مین دن بھر کے تکان، سفر سے چور، خاک سے اٹا ہوا، افسردہ دل، مُرجھایا ہوا تھا۔ جس چیز پر نگاہ ڈالتا تھا میری طرح مضمحل معلوم ہوتی تھی۔ وہی سنہری کرنیں جو ہر ذرّے کو خوشی کے لمحوں میں کندنی چمک بخش دیتی تھیں اس وقت ہر شے کو زرد رو بنائے ہوئے تھیں، دنیا میری طرح خزاں دیدہ، الم انگیز، حسرت زا محسوس ہوتی تھی، کُتّوں کے بھونکنے میں، غصہ اور چھیڑ کی جگہ درد کا پتہ چلتا تھا اور لونڈے جو سائیکل کو دیکھ کے تالیاں بجاتے تھے تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرا تمسخر کر رہے ہیں کہ "واہ رے تُم صاحب سارے جنت کے، سارے پاڑ بیلے اور میم صاحب کے کان بغیر بندوں ہی کے رہے!"

بہرنوع میں جب اسی طرح خاک آلودہ اپنے بنگلے پر پہونچا تو سامنے روش پر کرسیاں رکھی ہوئی دکھائی دیں، مارگریٹ کا پتہ نہ تھا، میں نے سمجھا اندر ہوگی، اردلی کو سائیکل دی، کھونٹی پر اپنی ٹوپی لٹکائی اور اندر چلا گیا۔ وہاں کپڑے بدلنے کے قبل میں نے سوچا، لاؤ روپیوں کو سیف میں بند کردوں۔ وہ سونے والے کمرے میں تھا، وہاں پہونچ کر اُنھیں بند کیا۔ جب پلٹنے لگا تو

سنگار میز پر نظر پڑی جس پر مارگریٹ کی آرائش کا سامان رکھا رہتا تھا۔ دیکھا تو سب غائب ہے۔ اور اسکی جگہ ایک خط رکھا ہے۔ حیرت سے آگے بڑھ کے اُسے اُٹھا لیا۔ جلدی جلدی کھولا۔ وہ خط یہ تھا"

انسپکٹر ٹم نے کوٹ کی جیب سے پاکٹ بک نکالی اور اس میں سے ایک خط، وہ میری طرف بڑھا دیا، لکھا تھا:۔

"ڈیر ٹم۔ میں آج میل سے لکھنؤ جا رہی ہوں، اب پھر واپس نہ آؤنگی۔ اسکی وجہ صرف اتنی ہے کہ گو میں تم سے محبت کرتی ہوں لیکن جواہرات سے تم سے بھی زیادہ! مارگریٹ"

میں نے خاموشی سے خط پڑھ کر انسپکٹر صاحب کی طرف بڑھا دیا، وہ لے پاکٹ بک میں رکھکر بولے "میں خط کا مطلب سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اردلی نے آکر خبر دی کہ صاحب سپرنٹنڈنٹ باہر کھڑے ہیں ——— میں خط لئے اُنکی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عادتاً سلام کرکے چپکا کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے میری صورت دیکھی، خط دیکھا اور اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا لیا ——— اپنے بنگلے پر لے گئے اور اپنے سیف سے کچھ کاغذات نکالے اور میرے سامنے رکھدئے۔ میں نے دیکھا تو کلکتہ پولیس کی مارگریٹ کے متعلق رپورٹ تھی۔ اُنھوں نے سارے خاندان کے حالات لکھکر اسکے متعلق یہ لکھا تھا کہ "یہ عورت بہت ہی کمسنی سے رنڈی کا پیشہ کرتی تھی اور اسکی ماں ہمیشہ اسکی بھولی صورت سے فائدہ اُٹھا کر نا کردہ کار جوانوں کو

تباہ کرتی تھی!"

میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرا مصمم ارادہ تھا کہ میں دنیا کو اس ناپاک ذات سے ہمیشہ کے لئے پاک کر دوں۔ مگر صاحب سپرنٹنڈنٹ بولے "میاں تم۔ یہ رپورٹ مجھے اس وقت مل چکی تھی جب کہ تم اپنی بیوی کو یہاں لیکر بھی نہیں آئے تھے۔ میں جانتا تھا کہ یہ عورت تم کو دھوکا دیگی۔ خیر انسان کچھ کھو ہی کر سیکھتا ہے۔ تم پولیس افسر ہو تمھیں ہر طرح کا تجربہ ہونا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "میں پولیس کی نوکری سے استعفا دیدونگا، مگر اس عورت کا خاتمہ کر دونگا۔"

وہ کچھ بولے نہیں بلکہ اُنھوں نے مجھے ساتھ بٹھا کے شراب پینا شروع کی ——— اور مجھے اتنی پلا دی کہ میں وہیں مدہوش ہو کر گر پڑا ——— دوسرے دن سے لین حاضر کر دیا گیا۔ اور آج تک اُسی ڈیوٹی پر ہوں!"

میں نے پوچھا "اور مارگریٹ؟"

وہ بولے "جی وہ کچھ دنوں اپنے بندے لینے اُس اینگلو انڈین جوہری کے ساتھ لکھنؤ میں رہیں۔ اب سُنا ہے کہ پھر کلکتہ میں اپنا مادری پیشہ کر رہی ہیں!"

سنہ ۱۹۳۷ء

اچھوت برہمن

آگرہ کا اسٹیشن، گرمیوں کا زمانہ، مسافروں کا ہجوم، اس پر انٹر درجے کا ٹکٹ۔ اگر میں گھبرایا ہوا تھا تو کوئی جائے تعجب نہیں۔ ڈر تھا کہ گاڑی بھری ہوئی آئیگی۔ اطمینان سے لیٹنے بیٹھنے کی جگہ نہ ملیگی۔ راستے بھر ہنگامہ شور و شغب رہیگا۔ اور نہ معلوم کتنی قسم کی نئی بیڑیوں کے متعفن دھوئیں کو انگیز کرنا پڑیگا۔ میں نے اسی لئے اُس دن کا لیڈر، پانیر، اسٹیٹسمین اور ہندوستان ٹائمز خرید لیا۔ پھر وہیلر کے کتاب گھر سے "اوپنہیم" کا ایک تازہ ترین ناول خریدا۔ میری رائے میں انگریزی مصنفین میں "ولیس" اور "وڈ ہاؤس" کی طرح "اوپنہیم" کی کتابیں بھی ریل کا سفر کاٹنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اس مصنف میں "شرلاک ہومس" کے مصنف کی طرح قوت استقراء تو نہیں ہے لیکن وہ نیلی چھتری کے مترجم سے کہیں زیادہ قرین عقل پیچیدگیاں، الجھاوے اور

اسرار اپنے پلاٹ میں سمو دیتا ہے۔ پھر اس میں جو ایک نغمہ ظرافت ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو مہذب و متین طبائع کو مرغوب ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں نے جیسا عرض کیا۔ اخباروں کے ساتھ ساتھ میں نے "اوپنہیم" کا ایک پھڑکتا ہوا ناول بھی خریدا۔ اور اب گویا پوری طرح مسلح ہو کر اپنے آرام و اطمینان کی دشمن بی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

بارے بی صاحبہ آئیں، خراماں خراماں، بل کھاتی، انگڑائیاں لیتی آئیں۔ اور مسافروں کا ٹڈی دل اُن پر ٹوٹا۔ اُترنے والے مسافر ڈبوں میں کھڑے ہیں۔ قلی ان کے سامان اُتارنے کی فکر میں منہمک ہیں۔ مگر جانے والے مسافروں کے قلی ان پر اس طرح غرا رہے ہیں جس طرح کوئی کتا اپنے گھر میں اپنے کسی اجنبی ہم جنس کو دیکھ کر غراتا ہے۔ اس عجلت اور جھلاہٹ کے دو سبب ہیں۔ ایک تو اپنے مسافر کے ساتھ ہمدردی جتا کر اس سے مقررہ و موعودہ مزدوری کے علاوہ انعام لینے کا بہانہ۔ دوسرے اپنے بابو جی کو ٹھکانے لگانے کے بعد اُترنے والے مسافروں میں سے کسی کا اسباب اُٹھائے جانے کی اُمید۔ چنانچہ میرا قلی بھی نہ معلوم کتنے قلیوں کو جھڑکتا، اور بیسیوں مسافروں کو دھکیلتا ہوا میرے اسباب کے ایک ڈبے میں گھس ہی گیا۔ اور میرا بکس اور بستر ایک بنچ پر رکھ کر ایک اُترنے والے مسافر سے اپنے لئے مزدوری چکانے لگا۔ مجھے بھی اپنے اسباب کے خاطر مع اخباروں اور ناول کے بنڈل کے اسی کشمکش سے

گزر کر ڈبے میں داخل ہونا ہی پڑا۔ اور میں نے جھٹ پٹ اپنا بستر کھول کر پورے برتھ پر قبضہ کر لیا۔

یہ سارا ہنگامہ چند ہی منٹ کا تھا۔ اس لئے کہ پورا ڈبہ اس اسٹیشن پر خالی ہو گیا اور اب میں "سکندر رسا لارک" کی طرح جو کچھ نظر آتا تھا سب کا مالک و مختار تھا۔ چنانچہ میں نے جلدی سے شیروانی اُتار کر اپنے بنچ سے قریب والی کھونٹی پر لٹکائی۔ پان اور سگرٹ کی ڈبیاں سرہانے تکیے کے نیچے رکھیں، پرس کُرتے کی جیب میں ڈال لی اور سارے اخبار و رسائل پہلو میں رکھکر بنچ پر دراز ہو گیا۔

مگر گرمی تھی کہ الاماں والحفیظ۔ نہ معلوم آگرے کی سرزمین میں اس بلا کی حدت کہاں سے آگئی ہے۔ شاید یہ ہزارہا کُشتگانِ ناحق کے خون کی حرارت ہے۔ جس سے آگرہ کی مٹی کا خمیر بنا ہے۔ یا اُس سوزشِ قلب کا نتیجہ ہے جس نے شاہجہاں کو تاج محل سا مقبرہ بنوانے پر بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ بہر نوع وجوہ خواہ جذباتی ہوں یا کیمیائی، جغرافیائی ہوں یا شاعرانہ۔ یہ یہی کہ آگرے سا جلتا بھنتا شہر ہندوستان میں کم ہی نکلیگا۔ میں نے اسی لئے "پانیر" سے وہی کام لینا شروع کیا جو آپ کو اس اخبار کے اشتہار کے سلسلے میں "چند و چوکیدار" لیتا دکھائی دیگا یعنی اسے بجائے پڑھنے کے اس سے پنکھا جھلنا شروع کیا۔

ابھی پسینہ خشک بھی نہ ہونے پایا تھا اور میں اشتہار کے اُس ٹکڑے پر کہ "تم اسے پڑھ بھی سکتے ہو" عمل پیرا نہ ہو سکا تھا کہ دفعتاً گاڑی کا بند دروازہ کھلا

اور ایک بابو جی داخل ہوئے یہی کوئی پچیس تیس برس کے رہے ہونگے ننگے سر، بال چھوٹے چھوٹے مشین سے کٹے ہوئے، چٹیا ذرا نمایاں، پیشانی پر قشقہ، قمیص دھوتی اور چپل پہنے، ایک ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی، ایک میں ایک کمبل میں تکیہ لپٹا ہوا، آئے اور برابر والے برتھ پر کمبل بچھا اور تکیہ لگا کر بیٹھ گئے۔ اٹیچی انھوں نے سامنے اس طرح رکھ لیا جس طرح پان بنانے والیاں پاندان سامنے رکھتی ہیں۔

میں نے اُنکی صورت شکل کا اخبار کے پیچھے سے جائزہ لیا۔ تو چہرے مہرے سے خاصے تیز اور پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ پیشانی بڑی اور چمکتی ہوئی۔ آنکھیں اوسط درجے کی مگر بھوری، کلا چوڑا، دانت سپید چمکتے ہوئے۔ داڑھی مونچھ دونوں صاف۔ ٹھوڑی ٹبری تھی اور بیچ میں ذرا دبی ہوئی۔ قد و قامت اوسط درجے کا تھا اور جسم خاصا سڈول تھا۔

بابو جی نے اپنا اٹیچی کھولا، اور اس میں سے اوپر ہی رکھا ہوا تولیہ نکالا اپنے چہرے اور گردن کا پسینہ پوچھا۔ پھر میری طرف مڑ پڑے۔

اُنھوں نے پوچھا "آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟"

میں نے کہا "لکھنؤ"

کیا وہیں دولت خانہ ہے؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔ دو ایک دن کے لئے وہاں قیام کر کے دوستوں سے ملنا ہے۔"

بولے "اچھا!"

میں نے سوچا کون زیادہ وقت ضائع کرے اخبار اور ناول پڑھنا ہیں۔ جلدی سے اُنکی طرف لیڈر بڑھا کر کہا "لیجیے آج کا اخبار دیکھیے گا؟"۔

اُنھوں نے "شکریہ" کہا اور لیڈر میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور گاڑی رینگ چلی۔ میں اخبار دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر میں نے یہ محسوس کیا کہ جس جس طرح ریل پٹریاں بدل رہی تھی اُسی اُسی طرح میرے ساتھی بھی پہلو بدل رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی اخبار کے سارے ورق اُلٹ گئے۔ پھر اُنھوں نے کھڑکیوں سے جھانکنا شروع کیا، پھر سیٹی بجانے لگے۔ پھر اٹیچی کھولا، اُس سے کچھ کاغذات نکالے، اُنکو اُلٹتے پلٹتے رہے۔ میں نے اُنکی بے چینی سے متاثر ہو کر بالآخر اخبار رکھ دیا۔ اور اُن سے کہا۔

"کیوں کیا کوئی دوسرا اخبار دوں؟"

وہ عجیب طرح مُسکرا کر بولے۔ "جی نہیں، میں نے ابھی یہی نہیں پڑھا"۔

میں نے پھر اپنا اخبار اُٹھایا، وہ فریادیوں کی طرح ہاتھ پھیلا کے بولے "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں عرض کر دونگا کہ آپ بھی اخبار نہ پڑھیں۔ (میں نے انھیں ذرا چین بجبیں ہو کر دیکھا، وہ جلدی سے بولے) میرا یہ مطلب ہے کہ بجائے اسکے ہم کچھ باتیں کریں۔

میں اِس عجیب و غریب فرمائش پر یقینی کوئی سخت جواب دیتا، مگر میں اُنکی

ملتجی صورت اور اُنکے حسرت بھرے لہجے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ شخص انسانی ہمدردی کا بھوکا ہے۔ اسکے دل پر کسی اہم راز کا بوجھ ہے جسے وہ کسی اجنبی سے کہہ کر ہلکا کرنا چاہتا ہے۔

میں نے اخبار رکھ دیا۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُن کی طرف سگریٹ کی ڈبیا بڑھا کر کہا "بسم اللہ شوق کیجیے!" اُنھوں نے تسلیم کر کے اس میں سے ایک سگریٹ نکال لی۔ پھر میری طرف اُسی کو بڑھا کر کہا "اب آپ میری جانب سے اسی سگریٹ کو پیجیے۔" میں نے انھیں پھر حیرت سے دیکھا۔ وہ بولے "جی میں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

میں نے گھبرا کر اُن سے پوچھا "کیا دولت خانہ لکھنؤ ہے؟"

اُنھوں نے مجھے استعجاب سے دیکھکر پوچھا "جی، آپ نے یہ کیونکر جانا؟"

میں نے کہا "آپ کی گفتگو اور تہذیب سے۔"

وہ بولے "جی ہاں، غریب خانہ وہیں ہے۔ میں پنڈتوں اور بڑے کٹر طرح کے برہمنوں کے خاندان سے ہوں، اِس لئے اس طرح کی کوئی چیز کبھی استعمال نہیں کر سکا۔"

میں نے کہا "تو آپ بڑے خوش قسمتوں میں سے ہیں۔ ہم لوگ خواہ مخواہ پیسے بھی ضائع کرتے ہیں، اور صحت بھی برباد کرتے ہیں۔"

کہنے لگے "جی، آپ کا ارشاد بجا اور درست ہے، مگر یہ بھی ضرور ہے

کہ لطف صحبت بغیر ان چیزوں کے حاصل نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر یہ تو آپ میرے خیال اور میری خاطر سے کہہ رہے ہیں، لیکن اتنا ضرور سچ ہے کہ بعض وقت اس سگریٹ سے غم غلط کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

میری زبان سے "غم غلط" کا لفظ نکلتے ہی اُن کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انھوں نے جلدی سے میرے ہاتھ سے سگریٹ لیکر مُنھ میں لگالی، میں نے دیکھا اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے اُنکی طرف دیا سلائی بڑھادی۔ اُنھوں نے بالکل ایک اناڑی سگریٹ پینے والے کی طرح سگریٹ جلائی۔ جلدی جلدی اُسکے دو تین کش کھینچے اور کھانسنے لگے۔ اُنکے آنسو آنکھوں سے بہ کر گالوں پر آگئے۔ میں نے گھبرا کر کہا "واجی اسے پھینک بھی دیجیے۔ آپ عادی نہیں، چکر آجائیگا۔"

اُنھوں نے سگریٹ پھینک دی، پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر سسک سسک کر رونے لگے۔ میں گھبرا کر اپنی سیٹ سے اُٹھا اور اُنکی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ میری قربت محسوس کر کے اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

اب ذرا آپ میری بے بسی کو محسوس کیجیے۔ ایکسپریس پوری رفتار سے چلی جا رہی ہے، پورے ڈبے میں ہم دو آدمی ہیں۔ دونوں اجنبی ضرور ہیں، مگر دونوں پڑھے لکھے بھلے مانس ہیں، آپس میں اب تک جتنی باتیں ہوئیں وہ

بھی خلوص و ہمدردی، تہذیب و شائستگی کی۔ ان میں سے ایک اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے، دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔ وہ سوائے اسکے اور کیا کر سکتا ہے کہ وہ اخباروں اور ناولوں کو چھوڑ کر اپنے ہمراہی کی دلدہی کرے اور اسکے غم و رنج کا سبب دریافت کر کے اس سے ہمدردی کرے؟ یہی انسانیت کا تقاضا ہے اور یہی فطرت و بشریت کا اقتضا۔ میں نے اُنکی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "پنڈت جی، یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ اس طرح کا رونا تو مردوں کو زیب نہیں دیتا۔"

وہ سسکتے ہوئے بولے "مگر جس طرح کا غم مجھ پر پڑا ہے، اگر پہاڑ پر بھی پڑتا تو وہ بھی پانی ہو کر بہ جاتا۔ میں تو پھر انسان ہی ہوں۔"

میں نے کہا "تو آپ مجھ سے بیان کر ڈالیے۔ اس سے دل کی بھڑاس نکل جائیگی اور طبیعت ہلکی ہو جائیگی۔"

اُنھوں نے اپنے تولیے سے آنسو پوچھ ڈالے۔ میں نے اپنی جیب سے نکال کر اُنھیں چند الائچیاں دیں۔ وہ اُنھوں نے چبائیں، پھر بولے۔ "آپ نے سچ کہا، مجھے زیادہ تکلیف شاید اسی لئے ہے کہ میں نے آج تک کسی سے اس قصے کو نہیں بیان کیا۔ مجھے خاندان کے نام کی بڑی لاج تھی۔ آپ اجنبی ہیں، ریل کا ساتھ ہے۔ خدا جانے آپ سے پھر کبھی اس جنم میں ملاقات ہو یا نہ ہو، میں سمجھتا ہوں آپ سے کہہ ڈالنے میں کوئی ہرج نہیں۔"

میں نے کہا "آپ اطمینان رکھیں، میں بھی اسے کبھی زبان پر نہ لاؤنگا۔"

وہ میری طرف مُڑ کر بولے "اچھا تو سُنیے۔ میں نے جیسا آپ سے عرض کیا۔ میں برہمن ہوں اور میرا خاندان بڑا کٹر ہے۔ بس اسی سے سمجھ لیجیے کہ میں اپنے گھر میں پہلا آدمی ہوں جس نے انگریزی پڑھی، ورنہ کسی نے سوائے سنسکرت کے کوئی دوسری زبان پڑھی ہی نہیں۔ سب ہمیشہ ہندو تعلقداروں کے خاندانی پروہت رہے۔ میرے متعلق بھی یہی خیال تھا کہ میں بھی خالی سنسکرت پڑھایا جاؤں۔ مگر میرے والد نے مجھے غیر معمولی طور پر تیز دیکھکر، دوستوں اور ملنے والوں کے کہنے پر انگریزی اسکول میں داخل کرایا۔ سارا خاندان اسی پر اُن سے خفا ہو گیا۔ دو چار نے تو کھانا، پینا، آنا جانا بند کر دیا۔ مگر وہ بھی اپنی ضد پر قائم رہے اور میں انگریزی پڑھتا ہی رہا۔ بس اُنھوں نے اتنا ضرور کیا کہ مجھے انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی آبائی زبان سنسکرت بھی پڑھاتے رہے۔ میں تمام امتحانات میں ہمیشہ اوّل آتا رہا۔ بلکہ دو چار درجوں میں میں نے انعامات بھی حاصل کیے۔ یہ دیکھکر اُنکے حوصلے اور بھی بڑھے اور اُنھوں نے طے کر لیا کہ وہ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلائینگے۔ جس سال میں نے انٹرنس کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا ہے اُنکی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اُنھوں نے مجھے خبر بھی نہ دی اور اپنے امیر عزیزوں سے قرض لیکر ایک بہت بڑا "ہَوَن" کیا اور برادری بھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ ایف۔ اے۔ کی تعلیم کا اُنھوں نے کیونکر انتظام کیا۔ اسے بھگوان جانے۔ مگر کتابوں کے دام دیتے وقت ماتا جی

نے صرف اتنا کہا کہ بیٹا، خوب جی لگا کر پڑھنا اور ایسا کرنا کہ برادری بھر میں ہماری ناک اونچی رہے۔" میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے کیننگ کالج میں نام لکھوایا اور پڑھنے لگا۔ وہاں تعلقہ داروں کے لڑکوں کا ساتھ، پڑھنا اور اُن سے مِلنا جُلنا، خواہ مخواہ ٹھاٹ باٹ پر مجبور کرتا تھا۔ ماں باپ کا یہ حال کہ میں جو کچھ کہتا وہ پورا کرتے۔ سائیکل لے دی، سوٹ بنوا دیے، فاؤنٹین پن خرید دیے۔ اور ان تمام خرچوں کے علاوہ دس روپیہ ماہوار مجھے جیب خرچ کے طور پر دیتے تھے۔ یہاں یہ حالت کہ یہ تو روزانہ کی چاٹ کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔ پھر سنیما کا بھی شوق ہو گیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گھر کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئی، اور میرا فیشن بڑھتا ہی گیا۔ لیکن میں بابو جی اور ماتا کے دل کو کہتا ہوں کہ اُن کے چہرے پر میل نہیں آیا۔ لوگ ان سے میری شکایت کرتے، میری فیشن پرستی اور فضول خرچیوں کی کتھا بیان کرتے، مگر وہ نہ مجھے ڈانٹتے، نہ روکتے۔ اُنکو مجھ پر پورا بھروسا تھا ——— بہرحال ایف، اے، کا امتحان آیا اور اس میں میں بیٹھا۔ میں نے اسکے لیے محنت تو بہت کی تھی، مگر وہی آخری وقت، جب نتیجہ نکلا تو میں پاس ہوا مگر تیسرے درجے میں۔ بابو جی کو اتنا رنج ہوا کہ وہ بیمار ہو گئے۔ انھیں دل کی بیماری پہلے ہی سے تھی۔ میرے تیسرے درجے میں پاس ہونے سے زیادہ، ہمچشموں کے طعنے اور برادری والوں کے ہنسنے نے۔ اُنکے ساتھ وہ کیا جو مٹماتے ہوئے دیا کے ساتھ ہوا کا تیز جھونکا کرتا ہے

اُنکی آتما تو دوسرے جنم کی تیاریوں میں مشغول ہو گئی اور میرے لئے ساری دنیا اندھیری رات بن گئی۔

پتا جی کی موت اور اُسکی رسمیں جیسے تیسے کی گئیں۔ اس میں ماتا جی کی سونے کی ہنسلی، ہاتھوں کے کڑے اور کچھ چھوٹے چھوٹے زیور بیچ ڈالنے پڑے۔ اب آپ ہی سمجھیے، میں اچھا خاصا ہٹا کٹا جوان، الف۔ اے۔ پاس، مگر بجائے اسکے کہ ماں کو کما کر کھلاتا، اُنکو دھارس دیتا، بیکاروں کی فہرست میں نام لکھوائے بیٹھا تھا۔ اور ماں کے کریا کرم کے لئے ماں کے زیور سناروں کے ہاتھ بیچ رہا تھا۔ میرے دل پر جو کچھ گزرتی تھی وہ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اِس طرح کی زندگی کتنے دنوں بسر ہو سکتی تھی؟ میں نے اب نوکری ڈھونڈھنا شروع کی۔ مگر نوکری تلاش کر لینا آج کل اتنا ہی آسان کام ہے جتنا کہ پیال سے بھری ہوئی بیل گاڑی میں زعفران کے بیج کا۔ ایک دفتر سے دوسرے دفتر، ایک دوکان سے دوسری دوکان کا پھیرا کرتے کرتے پاؤں دُکھنے لگتے، جوتے کا تلا گھس جاتا، مگر نوکری کی صورت خواب میں بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ یہ مصیبت تو خیر ہر نوجوان کو جھیلنا پڑتی ہے۔ میرے معاملے میں جو بُری بات ہوئی وہ یہ تھی کہ جس جس طرح میں ناکامیاب ہوتا جاتا تھا ویسے ہی ویسے مجھ میں جھلاہٹ بڑھتی جاتی تھی۔ نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی تھا اور نہ اب کوئی نوکر جاکر کہ اس پر یہ غصہ نکلتا، بس ماتا جی تھیں اور میں تھا، اور ساری جھلاہٹ اُنھیں کے بوڑھے چونٹوں کے

سرجاتی۔ وہ سیدھی بات بھی کہیں، تو میرے مرچیں سی لگ جاتیں، اُنکی ہمدردی دشمنی معلوم ہوتی اور اُنکی مامتا بالکل مکاری اور خود غرضی !"

میں سگریٹ جلانے لگا تو اُنھوں نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے پھر ایک سگریٹ کا خون کیا، اُنھوں نے اُسے "کانا" جلایا۔ جلدی جلدی دو تین کش اس طرح کھینچے کہ کھانسنے لگے۔ اور غصہ میں اسے چٹکیوں میں مسل کر پھینک دیا۔ پھر وہ بولے۔ "بھگوان ہی جانے کہ اگر بابو لچھمی پرشاد نہ آگئے ہوتے تو میری کیا دشا ہوتی۔ میں کسی دن ماتا جی اور اپنے کو جان سے مار کر اس جھگڑے ہی کو چکا دیتا، یا پھر پاگلوں کی طرح کہیں گلیوں میں تنکے چنتا ہوتا — بابو لچھمی پرشاد جی کرمی تھے، آریہ تھے، پتا جی کے بڑے ماننے والوں میں تھے اور متھرا سے ایک ہندی اخبار نکالتے تھے۔ لکھنؤ کسی ضرورت سے آئے تو بابو جی کے مرنے کی خبر معلوم کرتے ہی ہمارے یہاں پہونچے۔ ماتا جی اُنکو آواز سنائی تھیں، اُنھوں نے رو رو کر اُن سے اپنا سارا دُکھ درد کہہ ڈالا۔ لچھمی پرشاد جی پر بڑا اثر ہوا اور اُنھوں نے مجھ سے اپنے ساتھ متھرا چلنے کو کہا۔ ماتا جی بھی راضی ہوگئیں اور میں بھی اُنکی انسانیت اور اُنکی ہمدردی سے مجبور ہو کر اُنکے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہے، پھر بولے "متھرا پہونچتے ہی میری زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہو گیا۔ لچھمی پرشاد جی کی بڑی کوٹھی میں قیام، اچھے اچھا کھانے کے لئے، ایک علیحدہ باورچی خانہ اور کہار، اور اُنھیں کے دفتر میں ملازمت۔ مگر

ان سب سے زیادہ جس چیز کا سب سے گہرا اثر مجھ پر ہوا وہ انکی تیرہ چودہ سال کی لڑکی "رمو" تھی۔ مَیں اُسکی صورت شکل آپ سے کیا بیان کروں۔ ایک ٹھنگنے قد کی دُبلی پتلی لڑکی، گندمی رنگ، ہنس مکھ چہرہ، آنکھیں بڑی، شرارت سے بھری ہوئی۔ ہر وقت ہنستی اور چھیڑ چھیڑ کر ہنساتی تھی۔ ایک سکنڈ اس سے نچلا نہ بیٹھا جاتا تھا۔ کبھی گا رہی ہے، کبھی نوکروں کو بنا رہی ہے، کبھی بابو جی کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی ہے، اور کبھی میرا مُنھ چڑھا رہی ہے۔ ممکن ہی نہیں کہ آپ اُسکے پاس بیٹھے ہوں اور پھر آپ کے چہرے پر شکن دکھائی دے۔ آپ کو کسی امر کا غم بھی ہو، یا آپ کسی بات کی فکر بھی کر سکیں۔ اگر آپ بابو جی کے سنوں کے ہونگے تو آپ علیحدہ بیٹھے ہنستے ہونگے، لیکن اگر کہیں آپ نوجوان ہیں، بیس کے اندر ہی عمر والوں میں ہیں تو پھر آپ بھی تھوڑی دیر کے لئے رمو کی شرارتوں میں شریک ہونگے اور عجب نہیں کہ اسکے ساتھ فرش پر قلابازیاں کھاتے ہونگے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھیے گا کہ رمو کوئی بیوقوف مسخری لڑکی تھی۔ جی نہیں، وہ بلا کی ذہین بھی تھی اور اسکا جیسا حافظہ تو شاید ہی کسی کو ملا ہوگا۔ وہ جس کتاب کو ایک بار پڑھ لیتی وہ اسے حرف بحرف یاد ہو جاتی، بس اسی سے سمجھیے کہ بابو جی کا پورا پورا ایڈیٹوریل وہ ہر روز اخبار دیکھتے ہی اُنکے سامنے دُہرا دیتی، اور پھر باپ کے سامنے ہی انھیں کے کسی لفظ یا کسی فقرے کو لیکر ایسے ایسے جملے تراشتی، ایسی ایسی پھبتیاں کستی، کہ وہ بھی ہنسی سے بیتاب ہو جاتے۔ اس ذہانت اور اس حافظے کے بعد یہ کہنا کہ

اپنے درجے میں برابر اوّل آتی تھی اور اپنی پرنسپل اور اُستانیوں کی لاڈلی تھی ایک بیکار ہی سی بات ہوگی۔

مَیں جب متھرا پہونچا ہوں تو وہ نویں درجے میں تھی اور گھر پر گانا اور ناچنا سکھائی جا رہی تھی۔ چونکہ میں نے ایف، اے، ریاضی میں پاس کیا تھا۔ اس لئے بابو جی نے مجھ سے کہا کہ رمّو کی ریاضی کی طرف ذرا خاص خیال رکھنا۔ رمّو اس مضمون میں دوسرے مضامین سے نسبتہً کمزور تھی۔ اسکی وجہ بھی ظاہر تھی۔ وہ کسی مضمون پر جم کر گھنٹے محنت نہیں کر سکتی تھی اور ریاضی بغیر اسکے آتی ہی نہیں۔ بہرحال مجھے رمّو کی ریاضی ماسٹری بھی سپرد ہوئی۔

مگر پہلے ہی دن سے رمّو نے بجائے ایک اُستاد کی طرح عزت کرنے کے مجھ سے ایک کھلونے کی طرح کھیلنا شروع کر دیا۔ بہت دنوں کے بعد اسے ایک ایسا ساتھی ملا تھا، جو ایک حد تک اسکا ہم عمر بھی تھا، اور اسی کے گھر میں رہتا بھی تھا۔

ہم عمری کا لفظ مجھے کچھ دل میں کھٹکا سا تھا۔ اِس لئے کہ بابو صاحب مجھ سے بتا چکے تھے کہ وہ اس وقت اُنیس بیس برس کے تھے اور خود رمّو کا سن تیرہ چودہ برس کا تھا۔ گویا خاصا پانچ چھ سال کا فرق تھا۔ مگر میں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید میرے چہرے سے سمجھ گئے کہ مجھے اُن کے اس فقرے پر اعتراض سا ہے۔ اس لئے وہ رُک کر کہنے لگے "شاید آپ نے پانچ چھ برس کے فرق کو عورت مرد کی ہم عمری کے خلاف سمجھا ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔ پھر رمّو معمولی لڑکیوں سے بالکل ہی مختلف

تھی۔ وہ جتنی شریر، شوخ، چنچل اور تیز تھی، اُتنی ہی سمجھدار اور ذی فہم بھی تھی۔ اِس میں یہ خاص بات تھی کہ وہ ایک منٹ پہلے اگر آپ کو تیرہ برس کی لڑکی محسوس ہوگی تو دوسرے ہی منٹ میں ایک مکمل عورت۔ مزاج کیا تھا برسات کی رُت۔ ابھی ابر کا ٹکڑا ہٹا تو وہ تیز دھوپ کہ سارا نگر جل اُٹھا۔ ابھی ابھی کالا بادل جھوم کے برسا تو وہ ٹھنڈک، وہ آرام کہ بے ارادہ آنکھ بند ہوئی جا رہی ہے۔ ایسے سمے میں باتیں بھی ایسی پیاری کرتی کہ معلوم ہوتا بجلی گرانے والی رمو نہیں بول رہی ہے، بلکہ ماں ہمیں پالنے میں لٹائے لوری دے رہی ہے۔ آپ یوں بظاہر چاہے جاگتے ہی رہیں، اور بھلا رمو کے پاس بیٹھ کر کس کی شامت آئی ہے کہ وہ سو جائے۔ مگر آپ کی عقل، آپ کی خودداری، آپ کی آزادی رائے، سب کچھ سو جائیگی۔ آپکی حالت بالکل ہی مسمریزم سے معمول کیے انسان کی ہو جائیگی ——"

اب آپ ہی انصاف فرمائیے کہ ایک اُنیس بیس برس کا نوجوان مرد، اور ایک اس طرح کی چنچل لڑکی، رات دن کا ساتھ، تخلیے کی کوئی کمی نہیں، پڑھنے اور پڑھانے کا بہانہ، بڑا بوڑھا کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں، پھر اگر میں یہ بھول گیا کہ میں برہمن ہوں اور رمو ایک شودر، تو کون سی تعجب کی بات ہے؟ میری باتوں سے تو آپ سمجھ ہی گئے ہونگے کہ رمو میں تمام وہ خوبیاں، وہ صفتیں موجود تھیں جن کی ایک معشوقہ، یا ایک بیوی میں تلاش ہوتی ہے۔ وہ جس گھر میں بھی بیاہ کے جاتی وہاں راج رجتی، شوہر کے دل کی مالک بنتی، ساس سُسرے کے دل میں

ٹھنڈک ڈالتی اور اپنوں پرایوں کا من موہ لیتی۔ مگر میں نے شاید آپ سے یہ نہیں کہا کہ انشاپردازی سے اُسے ایک فطری لگاؤ تھا اور آپ کا یہ خادم بھی اس فن سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ چنانچہ بابوجی کی نگرانی میں چند ہی دنوں میں میں نے اخبار کے ادبی حصۂ نظم و نثر کو اڈٹ کر کے اس میں چار چاند لگا دیے۔ خود میرے مضامین اور نوٹ کی پبلک میں دھوم مچ گئی۔ اور رمّو کی یہ حالت تھی کہ وہ تعریف کرتے کرتے چشم پُرآب ہو جاتی تھی ..... اُف !

بھائی صاحب دُنیا میں مصنف، شاعر مضمون نگار سے زیادہ چاپلوسی اور تعریف کا بھوکا کوئی رئیس اور بادشاہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہم مصنفوں نے ہی اپنی کمزوری بادشاہوں اور ڈکٹیٹروں کے سر منڈھ دی ہے۔ بادشاہ اپنی طاقت، اپنی حکومت، اپنے اختیارات کی وسعت پر اگر گھمنڈ کرے اور ایسوں کی چاپلوسی سے خوش ہو جنکی جان و عزّت، آبرو اسکے قبضہ قدرت میں ہو، تو کوئی جائے تعجب نہیں، لیکن ہم مصنفین، انشاپرداز اور شاعر جنکے قبضے میں سوائے ایک ٹوٹے سے قلم اور ایک ورق کاغذ کے کچھ نہیں ہوتا، چند ٹیڑھے ترچھے نشانات بنا کر اتنا گھمنڈ کرتے ہیں کہ ضحّاک وافراسیاب، دیو ردھن اور راون کا غرور بھی اس کے سامنے شرماتا ہے۔ پھر اگر کہیں تعریف کرنے والے بھی مل گئے، تو ہم میں سے ہر ایک "گدائے متکبر" ہی نہیں بن جاتا ہے بلکہ مرکز و منبع صید تبختر و افتخار بن جاتا ہے۔ میرے معاملے میں تو مجھے رمّو کی چُپڑ نے مارا۔ اسکے تعریف کرتے ہوئے چمکتے چہرے، اور اُسکی

نم آلود غزالی آنکھوں نے اس طرح بیخود و بدحواس بنا دیا کہ میں اپنی اصل اور اُسکی نسل سب کچھ بھول گیا..... ہائے اِس بھول جانے میں کیسا امن، کیسا اطمینان اور کیسا رس تھا! بس اسی سلسلے کا ایک واقعہ مثال کے طور پر بیان کر دوں۔ میں آپ کو زیادہ زحمت تو نہیں دے رہا ہوں؟"

میں نے جلدی سے کہا "نہیں! نہیں! میں بڑی دلچسپی سے سُن رہا ہوں!"

اُنھوں نے خود بڑھ کر میرے سامنے رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اُٹھالی اور پھر ایک سگریٹ نکال کر جلائی، پھر دھواں اندر کھینچتے ہی کھانسنے لگے اور پھر اُنھوں نے اُسے جلدی سے کھڑکی سے پھینک دیا۔ میرے شکریہ پر وہ ذرا سے چونکے۔ گھبرا کر بولے "بھائی صاحب مجھے معاف کیجیے گا۔ میں نے بغیر اجازت لیے پھر آپکی ایک سگریٹ کا خون کیا۔"

میں نے کہا "پنڈت جی اب تو ہمارے آپ کے تعلقات ان تکلفات سے بالاتر ہو چکے ہیں۔" اُنھوں نے ہاتھ جوڑ کر بڑے خلوص سے مجھے سلام کیا۔ پھر بولے۔

"واقعی آپ بڑے شریف اور نیک ہیں..... ہاں تو میں آپ سے ایک چھوٹا سا واقعہ رمو کی قدردانی کا بیان کرنے جا رہا تھا۔ آپ اسی سے سمجھ لیں گے کہ اس چھوٹی سی لڑکی کی تعریف میں کیسا جادو بھرا تھا۔ ایک دن میں نے عشق مجازی و حقیقی سے بحث کرتے ہوئے اخبار میں لکھا "پریمی مدن کے بان کا شکار ہوتا ہے، مگر گیانی اِس بان کا نشانہ بنتا ہے جس نے مدن کو پریم کا دیوتا بنا دیا۔" میں اس

فقرے کے لکھنے پر خود بھی خوش تھا لیکن جب میں اخبار نکلنے پر گھر پہونچا۔ تو میں نے
دیکھا تازہ اخبار ہاتھ میں لیے رمّو چھاتک پر منتظر کھڑی ہے، اسکے بال بکھرے ہوئے
تھے، اسکی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ وہ دیکھتے ہی میری طرف جھپٹی، اور
اس نے میرا داہنا ہاتھ اپنے کنول سے ہاتھوں میں لیکر اپنی ہرنی کی سی آنکھوں سے
لگالیا ـــــ اور یہ سب اس قدر سُرعت، بیساختگی اور خلوص سے کہ میں ایک لفظ
بھی زبان سے نکال نہ سکا، اور یہ اظہار عقیدتمندی انجام پاگیا! میں نے کوئی
نصف منٹ بعد اس بظاہر دلربا مگر باطن صاعقہ گرانے والی بلا سے پوچھا تو اس نے
ایک جوہی کی ٹہنی سے زیادہ نازک انگلی، گلاب کی پنکھڑی ایسے ہونٹ پر رکھ کر اشارہ
میں خاموش رہنے کا حکم دیا، اور ہاتھ پکڑے مجھے میرے کمرے میں لائی۔ وہاں
میں نے سناتن دھرمی ہونے کی وجہ سے ایک چھوٹی سی مورتی پیتل کی رکھ چھوڑی
تھی، میں نے دیکھا تو آج اس مورتی کے سامنے کچھ پھول اور مٹھائی رکھی ہے اور
ایک بتی جل رہی ہے۔ مجھے تعجب سا ہوا، کہ رمّو آریہ سماجن کو اس طرح کے پوجا سے
کیا مطلب۔ مگر وہ مجھے کھینچتی ہوئی مورتی کے سامنے لائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر
بولی "اے بھگوان تو سدا ان ہاتھوں کو اور اس میں رہنے والے قلم کو اپنے سرن
میں رکھیو!" پھر مورتی کے سامنے رکھے ہوئے ہار اُٹھا کر میرے گلے میں ڈال دیئے۔
میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ارے یہ کیا کر رہی ہو رمّو۔ تم کو آج کیا ہو گیا ہے" تو وہ ہر لحہ ہنسنے والی

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کے بولی۔

"من کے بان کے شکار خود ان کو شکار کرنے والے کی یونہی پوجا کرتے ہیں!"...... اُف! کیسی من موہنی گھڑی تھی!......"

اور پھر میرے ایک سگریٹ کا خون ہوا۔ پھر میری طرف دیکھکر معافی مانگنے والے انداز سے اُنھوں نے دیکھا۔ پھر وہ خاموش ہو رہے اور بہت آہستہ آہستہ بولے "غرض ان دو برسوں میں، میں صرف ایک ایڈیٹر اور ایک ماسٹر ہی نہ رہا۔ بلکہ ایک دیوتا اور ایک پُجاری بھی بن گیا!......"

ایک بڑے اسٹیشن پر گاڑی رُکی، دو ایک نئے مسافر ہماری گاڑی میں بھی سوار ہوئے۔ میں نے دیکھا بابو جی تخلیہ نہ باقی رہنے اور آپ بیتی کے ناتمام رہ جانے سے پہلو بدلنے لگے۔ خود میرے یہاں اختتام سُننے کے لئے دل بےچین تھا، تکنے لگے تھے۔ میں نے اُن سے کہا "میری ہی سیٹ پر چلے آئیے" وہ مع اپنے سوٹ کیس کے میرے ہی برتھ پر آ بیٹھے، اور گاڑی کے روانہ ہونے کا بےچینی سے انتظار کرنے لگے بالآخر گاڑی چلی۔ میں نے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

وہ آہستہ سے بولے "میں جال میں نئی پھنسی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ ماں کا ڈر، وہ کٹر سناتنی، بڑے خاندان کی برہمنی، رتو شودر، پھر آریہ سماجی میں کسی کو چھوڑ نہیں سکتا تھا، ماں بوڑھی بیکس کیا کرتی۔ میں ہی تو اُس کا آسرا، اُسکا سب کچھ تھا۔ رتو ہنوز رمو، آپے سے گزرتی جاتی تھی۔ میرے محسن کی لڑکی

تھی - ایسے آدمی کی، جو مجھ ڈوبتے کے لئے، کنارہ لگنے کا سہارا بنا، جس نے مجھے صرف میری پسند کا کام ہی نہ دیدیا بلکہ اپنی کوٹھی میں جگہ دی، تن کو وستر اور کھانے کو بھوجن دیا۔ جو مجھ سے رمّو سے کچھ ہی کم پریم کرتا تھا۔ اسکی رمّو اکلوتی بیٹی - لاکھوں میں ایک بیٹی، مجھ سے پریم کرتی - میرے ایک ایک لفظ پر جھومتی اور ایک ایک مضمون کو سو سو بار دُھراتی، بس یہ ٹوٹی ہوئی ناؤ پریم ساگر میں بہ چلی! ـــــ نہ طوفانی جھونکوں کا ڈر اور نہ کنارے لگنے کی آس! - نہ جانے کیا ہوتا، کہاں پہونچتا، کہ دفعتاً ماں کی چٹھی ملی - "تمھارے لئے کنیا ڈھونڈھ نکالی ہے، تم جلد آؤ، تو میں چاند سی بہو گھر میں لاکر اپنے کھنڈر کو اجالا کروں" ـــــ سچ مانیے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی - معلوم ہوا سوتے میں جیسے کسی نے "فاختہ اُڑا دی ہو" سکھ آنند کی نیند سے چینختا ہوا جاگا - رمّو چہرے مُہرے سے بھانپ گئی - ہزاروں سوگند دے کر مجھ سے خط لیکر اُس نے پڑھ ڈالا - بس اسی سے سمجھیے کہ رمّو کس طرح کی استری ہے، کہ وہ اس خط کو دیکھکر نہ روئی، نہ اُس نے کوئی رنج ظاہر کیا، بلکہ کھلکھلا کر ہنس پڑی - میں نے جب اسے ذرا غصے اور تعجب سے دیکھا تو وہ بولی۔

"اس چٹھی میں کون سی نئی بات لکھی ہے جس پر اتنا لمبا چہرا بنایا جاتا ہے - یہ تو ہنسنے کی بات ہے - تمھیں ایک کی جگہ دو داسیں مل جاتی ہیں - ایک تو خود سے تیار ہے، دوسری کو ماتا جی اپنی خوشی سے لاتی ہیں"

میں نے جھلا کر اسکا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمھارے

پریم میں کسی اور کو بھی شریک کر سکتا ہوں ؟"

وہ مسکرائی اور بولی " نہیں اسی کا تو ڈر نہیں - اسی لیے تو ہنسنے کو کہتی ہوں"

میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا " تم پریم کو بچوں کا کھیل سمجھتی ہو؟"

وہ لپکی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئی اور چند منٹ بعد بابو جی کو ساتھ لیے آ پہنچی - میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا - وہ بھی کچھ گھبرائے ہوئے آئے تھے - وہ کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ رمو نے جھپٹ کر کرشن جی کی مورتی ہمارے درمیان والی میز پر رکھ دی - اور بابو جی کو مخاطب کر کے بولی " بابو جی آپ میرے دیوتا ہیں اور انکے دیوتا کی مورتی انکے سامنے رکھی ہے - میں دونوں دیوتاؤں کے سامنے سوگند کھاتی ہوں کہ میں اس جنم میں، اور ہر جنم میں، بس انھیں کی داسی بنکر رہونگی - چاہے اِس میں آپ ناخوش ہوں، چاہے اس میں بھگوان ناخوش ہوں، مگر آپ کی رمو دل سے انھیں کی ہے، اور انھیں کی رہنے میں اپنے لیے نروان اور مکتی سمجھتی ہے اور رہیگی !"

بابو جی گھبرا کر " رمو، رمو، کیا کہتی ہے، ارے تجھے کیا ہوا بیٹی !" کہتے رہے، مگر اُس نے جب تک سوگند نہ کھالی، نہ رُکی - میں سر پکڑے بیٹھا رہا - میں چاہتا تھا بابو جی مجھکو دغاباز، پاجی، کمینہ کہہ کر جوتوں، ڈنڈوں اور ڈھیلوں سے مار کر گھر سے نکال دیں - میں احسان فراموش، محسن کش تھا، میں نے جس برتن میں کھایا تھا اُسی میں چھید کیا تھا - جس شاخ پر بیٹھا تھا اُسی کو کاٹ کر ڈھا دیا تھا - مگر وہ خاموش سر جھکائے بیٹھے رہے - اُنھوں نے دو مرتبہ کرسی سے اُٹھنے کی

اُٹھنے کی کوشش کی مگر وہ نہ اُٹھ سکے۔ آخر اُنھوں نے مجھے بڑی حسرت سے دیکھا۔ میاں صاحب میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نظر میں کتنی شکایت، کتنی امید، کتنی تمنا، کتنا ڈر ایک ساتھ سمویا ہوا تھا! میں کانپنے لگا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا:۔

"بابو جی میں رمو کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہوں اور اُسکی دیویوں سے زیادہ عزت کرتا ہوں ہم دونوں پردیسی ہیں، پاپی نہیں ہیں!"

میں نے دیکھا کہ اُنکے چہرے سے وہ تناؤ، وہ خشکی اور وہ روکھاپن کم ہو گیا جو اس پر رمو کی باتوں کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے دو مرتبہ آہستہ آہستہ کہا:۔ شکر ہے! شکر ہے!"

میں نے انکی طرف وہ خط بڑھا دیا، جو ہمارے دل کی دبی ہوئی آگ کو بھڑکانے والا ثابت ہوا تھا۔ اُنھوں نے اُسے شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ رمو جو میری گفتگو کے وقت ایک ملتجی، معافی مانگنے والے گنہگار کی طرح اُنکے سامنے کھڑی تھی، اب اُنکی کرسی کے پیچھے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے بابو جی کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ وہ بابو جی کے خط ختم کرتے ہی بولی "بابو جی بس اتنی سی بات کے لئے یہ دل کُڑھاتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا، دیوتاؤں کے سیکڑوں داس اور داسیاں ہوتی ہیں۔ میرے دیوتا کے بھی اگر ایک کی جگہ دو داسیں ہونگی تو میرا دل کیوں کُڑھیگا؟ میں تو خوش ہونگی کہ جس سے میں پریم کرتی ہوں، وہ میری دوسری بہن کی نظریں بھی پوجے جانے کے لائق ہے!"

بابوجی نے مڑ کر بیٹی کو دیکھا، اُنکی آنکھیں اُسکی ان باتوں سے خوشی میں چمک رہی تھیں، لیکن وہ اسے شاباشی دینے کی جگہ بولے "یہ ساری بچپنے کی باتیں ہیں رمّو۔ میں تم دونوں کی شادی کی اجازت دے سکتا ہوں، مگر تمھارے لئے سوکن لانے کی نہیں!"

وہ مچل کر بولی "کیوں بابوجی، جب میں خود راضی خوشی سے اسکے لئے تیار ہوں تو آپ کو اس میں کاہیکا سوچ!"

اُنھوں نے زرا جھنجھلا کر کہا "تم لاکھ پڑھی لکھی سہی، مگر تم سوکنوں کے جلاپے، آپس کی تُو تُو مَیں مَیں کو کیا سمجھو ـــــ پھر وہ برہمنی ہوگی۔ کسی پُرانے گھر کی۔ تم سے ذات میں بڑی۔ وہ تم کو شودر کہہ کر گھر سے کھڑے کھڑے نکال دیگی!"

وہ ہنسکر بولی "میں ان کے محل کے پاس پھوس کا جھوپڑا ڈال کے اُس میں رہنے لگونگی!"

اُنھوں نے بیٹی کی طرف حسرت سے دیکھا۔ میں نے کہا "بابوجی میں اتنے پریم کا جواب ان کے سوا کسی دوسرے سے شادی کر کے نہیں دے سکتا۔ میں تو رامو کے سوا کسی اور کو اپنے گھر کا مالک سوچ بھی نہیں سکتا!"

وہ متین ہو کر بولی "یہ سچ سہی۔ پر آپ شاید اپنی ماتا کو بھول گئے۔ اُنھوں نے آپ کو کتنے پریم سے، کیسے کیسے دُکھ سہہ کے پالا ہے! وہ تو شاید رمّو کو اپنی بہو کی حیثیت سے سوچ بھی نہ سکینگی! کیوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں!۔

ایسی بات کیجیے کہ ان کا دل بھی نہ دُکھے !"

بابو جی نے گھبرا کر کہا " اچھا بھئی تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ہن جی سے اکیلے میں باتیں کرونگا۔"

رمّو کی زندگی میں پہلی دفعہ اس سے بابو جی نے کسی بات کے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو وہ باپ سے لڑ پڑتی۔ مگر وہ اس وقت چپکی کمرے سے باہر کی طرف چلی۔ دروازے کے پاس ٹھٹکی۔ مُڑ کر بولی " بابو جی آپ دونوں میرے لئے جو چاہیں فیصلہ کریں، پر اتنا دھیان رہے کہ رمّو ان سے بیاہ اسی شرط پر کریگی کہ یہ اپنی ماتا کو ناخوش نہ کریں، اور اپنی ذات برادری کی استری بیاہ لائیں !" وہ یہ کہتی چمک کر کمرے کے باہر چلی گئی۔ بابو جی جھلا کر کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ وہ بولے " تم دونوں نے مل کر مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ خیر وہ تو بچہ ہے، لڑکی ہے، تم کو کیا ہُوا تھا ؟ تم نے چپکے چپکے ہنڈیا پکالی، اُس کا دل چھین لیا، اسے بالکل اپنے بس میں کر لیا تو آج جا کر مجھ پر بھید کھُلا ——— !

میں نے بات کاٹ کر ہاتھ جوڑ کر کہا " بابو جی، میں اپنے قصور کا اقرار کرتا ہوں، مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سوائے آج کے ہم میں کبھی پریم کے بارے میں بات چیت بھی نہیں ہوئی ———"

وہ بولے " یہ سب سہی، پر رمّو کو اپنے دل کی حالت تو معلوم تھی، تم خود رمّو کی حالت تو دیکھ رہے تھے۔ میرے ہی گھر میں بیٹھے پینگ بڑھاتے رہے.....!"

میں نے ان کا پاؤں چھو کر کہا "آپ میرے باپ کی جگہ ہیں، مجھ سے چوک ہوئی، مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے آپ ہر طرح کی سزا دے سکتے ہیں ——"

وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے "اب میں تمھیں سزا دے کر کیا پاؤنگا؟۔ رمو قسم کھاتی ہے کہ وہ سوائے تمھارے کسی سے شادی نہ کریگی۔ پھر اس بات پر اڑی ہے کہ تم سے شادی جب ہی کریگی جب تم ایک برہمنی بیاہ کے لاچکو گے۔ تم کہتے ہو کہ سوائے اسکے کسی سے بیاہ نہ کرو گے۔ میں چاہے کچھ ہو جائے، سوکن ہوتے ہوئے اسے تم سے نہ بیاہ ہونگا۔ پھر تمھاری ماں موجود ہیں۔ وہ کٹر سناتن دھرمی، پرانے ڈھنگ کی، وہ اپنی برادری ہی میں برابر والوں میں شادی کرینگی۔ تم کو رمو جیسی کرمن سے تو کسی طرح بیاہ کرنے نہ دینگی —— تم کہتے ہو چوک ہوئی، بھول ہوئی، یہاں اتنی سی بات میں وہ گتھی پڑگئی کہ جس میں چار پانچ زندگیاں برباد جاتی نظر آتی ہیں —— تمھاری ماں کی، میری، خود تمھاری اور ان سب سے زیادہ رمو کی —— اے بھگوان میں کیا کروں؟"

میں نے کہا "اچھا تو میں آج ہی ماتاجی کے پاس جاتا ہوں، ممکن ہے وہ مان جائیں!"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "اچھا تم اپنی سی کر دیکھو، پر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ وہ نہ مانینگی!"

لکھنؤ کے لئے ایک ہی گھنٹے میں گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ اِس لیے میں نے

اُنھیں کے سامنے جھٹ پٹ اپنا سامان درست کیا اور رتو سے بغیر ملے اسٹیشن
لئے چل کھڑا ہوا۔ راستہ بھر ماتا کی ناخوشی سے زیادہ، اسی کا خیال رہا کہ رتو
اپنے دل میں کیا کہتی ہوگی، کہ میں اس سے ملے بغیر اس طرح بھاگ آیا۔ اور
پھر میں نے اُسے جن جن روپوں میں اُس دن دیکھا تھا وہ بار بار آنکھوں کے
سامنے پھرتے تھے۔ اور ہر ایک ان میں سے ایسا پیارا تھا کہ جی چاہتا تھا بس
اسی طرح دیکھے جاؤ ——— اُف!" وہ زرا رُکے تو میں نے اُنکی طرف سگریٹ
کی ڈبیا بڑھا دی۔ اُنھوں نے ایک سگریٹ جلائی۔ اسی طرح گھبرا گھبرا کر کش
کھینچے۔ نصف سے زیادہ سگریٹ کا کاغذ جل گیا۔ پھر کھانسی آئی پھر سگریٹ پھینک
دی گئی۔ پھر وہ بولے:۔

"جب میں گھر پہنچا تو میں نے دیکھا ماتا جی نے "چٹ منگنی پٹ بیاہ"
کے سارے سامان کر رکھے ہیں۔ پرتاب گڑھ میں ایک مشہور شاستری جی تھے، اُنکے
لڑکی تھی۔ ماتا جی خود لڑکی کو جا کر دیکھ آئی تھیں، اور وہ اُنھیں دل و جان سے
پسند تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُنھوں نے اُسکی تعریف میں قصیدے پڑھنا شروع
کر دیے۔ اب زرا میری شکل کو خیال کیجیے، وہ تو اُدھر ہونے والی بہو کے گن
گا رہی ہیں، اور میں اِدھر پہلو بدل رہا ہوں کہ یہ کسی طرح چُپ ہوں تو میں اپنی
رام کہانی سناؤں، مگر وہ کہاں چُپ ہونے والی تھیں۔ ایک دریا تھا کہ اُمڈا
چلا آتا تھا۔ آخر میں نے بات کاٹ کر کہا "ماتا جی زرا میری بھی بات سُن

لیجیے " اور انکے کچھ متعجب اور خفا ہو کر چپ ہو جانے پر میں نے گردن نہورا کر ساری کتھا کہہ ڈالی - ایسا معلوم ہوا جیسے اُنھیں سکتہ سا ہو گیا - وہ چپ میری ساری باتیں سُنا کیں - جب میں نے اِس جملے پر ختم کیا کہ " ماتا جی رتو شودر سہی، مگر ایسی اچھی کنیا تو اس لوک اور پرلوک میں مجھے نہیں مل سکتی ، اور میں تو اگر بیاہ کرونگا تو اسی سے ! "

تب وہ چونک کر ایک بار بولیں " ارے تو کیوں ہندو دھرم کو بدنام کرتا ہے ؟ پاپی ! جو شودرن سے بیواہ کریگا اسے مکتی کہاں نصیب ! "

میں نے کہا " بھگوان اتنا ظالم نہیں ہو سکتا کہ خود ہی تو دلوں میں پریم ڈالے اور خود ہی پھر اتنی سخت سزا دے ! "

وہ جھڑک کر بولیں " چل چل ! تو بڑا بھگوان کا چاہنے والا آیا - کرسٹن سے آشنائی کریگا ——— "

بس وہ اتنی کہنے پائی تھیں کہ مجھے ایسا جان پڑا کہ ایک لُو کا سا اُٹھا اور میرے سارے جسم کو بھسم کر گیا - میں نے اندھے پن سے ماتا کے منہ پر طمانچہ مار دیا - وہ بھونچکی ہو کر تھوڑی دیر تو میرا مُنھ تکتی رہیں، پھر اپنا کلا سہلا کر آنسو ڈبڈبائے بولیں " اگر میں نے تجھے جنا نہ ہوتا تو آج میں تجھے ایسا سراپ دیتی کہ تو ستر جنم تک اسکا پاپ جھیلتا - لیکن میری ماتا سے نہیں ہوتا - پھر بھی اتنا ضرور کہونگی کہ تو اپنی کرسٹن کو اس گھر میں میرے مرنے سے پہلے نہیں لا سکتا - پہلے

میرا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ دے پھر تیرا جو جی چاہے کر!"

ماتا جی تو اسی طرح کوستی اور بُرا بھلا کہتی رہیں۔ لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں اُنھیں طمانچہ مارتے ہی کانپنے لگا، میری آنکھیں کھُل گئیں۔ میں نے آج اِس پریم کے کرتوتوں اپنی ماتا پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہائے میں کتنا نیچ، کتنا کمینہ ہو گیا تھا! پریم اگر انسان کو اس طرح اندھا بنا دیتا ہے، تو لوگ بے پریم ہی کے اچھے! میں نے دوڑ کر اُنکے چرنوں میں سر ڈال دیا اور اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ بھی اس وقت بڑی کٹھور بن گئیں اور اُنھوں نے مجھے ٹھوکر مار دی۔ میں زمین پر گر پڑا۔ وہ یہ کہتی ہوئی کہ "مجھے نہ چھو پاپی!" دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔"

پنڈت جی نے مجھ سے ایک الائچی مانگ کر بغیر چھیلے مُنھ میں رکھ لی۔ بڑے زور زور سے دانتوں سے کچلی۔ پھر کچھ عجیب طرح کا مُنھ بنا کر کھڑکی سے مُنھ نکال کر تھوک دی۔ میں نے کہا "کیا خراب تھی؟ دوسری دوں؟ ——"

وہ بڑی مایوسی سے بولے "نہیں اس وقت امرت بھی زہر معلوم ہوگا، مُنھ کا مزا ہی کڑوا ہے!"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد بولے "ماتا جی سے مجھ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ دوسرے دن صبح تک اس کمرے سے نہ نکلیں میں دوسرے ہی دن متھرا بھاگ آیا۔

یہاں آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ بابو جی نے رتو کو سمجھا بجھا کر دو تین ہفتے کے لئے الہ آباد اپنے ایک عزیز کے یہاں بھیج دیا ہے۔ میں نے ان سے جب ماتا جی کی باتیں دُہرائیں تو وہ صرف اتنا بولے کہ " میں تو یہ پہلے ہی سے جانتا تھا "۔ میں نے اُسی دن اُنکی کوٹھی چھوڑ دی اور دفتر سے قریب شہر میں ایک چھوٹا سا مکان لیکر اُس میں اُٹھ آیا۔ وہ منع کرتے ہی رہے مگر میں نے کہا " کافی نمک حرامی ہو چکی، اب اس سے زیادہ ممکن نہیں!"

نئے مکان میں رہتے ہوئے کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن مجھے رتو کا ایک لمبا چوڑا خط ملا۔ اس نے کوٹھی چھوڑ دینے اور نئے مکان میں کرایہ پر رہنے کی شکایت کی تھی، اور یہ لکھا تھا کہ وہ خود ماتا جی سے ملنے لکھنؤ جا رہی تھی۔ میں یہ پڑھتے ہی گھبرا گیا۔ میں ماتا جی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ رتو کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جائینگی اور وہ اسکے ساتھ وہی سلوک کرینگی جو " منو " کے زمانے میں برہمن شودر سے کرتے تھے۔ میں گھبرایا ہوا بابو جی کے پاس پہونچا۔ وہ بھی پریشان ہو گئے۔ اُنھوں نے طے کیا کہ ایسے موقع پر اُن کا بھی بیٹی کے پاس پہونچ جانا ہی بہتر ہے۔ وہ سیدھے لکھنؤ گئے۔ مگر وہاں اُس وقت پہونچے جب کہ میری ڈائن ماں رتو کو ہزاروں گالیاں دے کر رسوئی کی جلتی ہوئی لکڑی سے مار مار کر نکال رہی تھیں۔ بابو جی نے اپنی ناز سے پلی ہوئی رتو کو گود میں اُٹھا لیا، اور تانگے پر لاد کر اسٹیشن لائے اور وہاں سے سیدھے متھرا۔

پنڈت جی نے رُک کر سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، میں نے جلدی سے سگریٹ نکال کر پیش کی۔ اُنھوں نے اسے جلایا، دو کش کھینچے، کھانسے اور کہا "ماتا جی کی اِن باتوں نے رمو کو اتنا صدمہ پہونچایا کہ وہ گاڑی ہی سے بیمار ہوئی، سخت بخار آیا، سرسام ہو گیا، سرسامی حالت میں برابر یہی کہتی رہی "میں شودرن ہوں، بیسوا ہوں، پاپن ہوں۔ میں نے ایک برہمن لڑکے کو پھنسا لیا اُسے بیدھرم کیا! ارے ماتا جی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ارے چُپ رے ڈائن، نکمّی، نیچ، کمینی!"

وہ پھر چُپ رہے۔ انکے ہونٹ کانپتے رہے۔ گاڑی کانپور اسٹیشن پر رُکنے کے لیے پٹری بدل رہی تھی، میں نے اس درد بھری کہانی کا انجام سننے کے لئے پوچھا "تو اب تو وہ اچھی ہیں؟" اُنھوں نے مجھکو پاگلوں کی طرح گھبرا کر دیکھا "جی، پرسوں شام کو وہ اچھوت لڑکی ایسی جگہ چلی گئی جہاں میری ماں کی سی تہمت لگانے والی اِستریاں ہیں اور نہ مجھ سے ڈال کے ٹوٹے برہمن! میں نے کل شام کو اُسکی چِتا اپنی آنکھوں سے جلتی دیکھی!"

اِس ملاقات کے تیسرے دن میں نے پائنیر اخبار میں ایک خبر پڑھی:۔
"کل گنیش گنج میں دو صد درجہ دردناک قتل ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پنڈت ترلوکی موہن جو متھرا میں کسی ہندی اخبار کے اڈیٹر تھے۔ اپنی ماں کے

قریب زخمی تڑپتے ہوئے پائے گئے۔ انکے پاس ہی دونالی بندوق پڑی تھی۔
محلہ والوں کا بیان ہے کہ وہ جب فیر کی آواز سن کر اندر داخل ہوئے تو پنڈت جی
کی ماں کی زبان کٹی پڑی تھی اور گولی اُن کے سینے کے پار تھی۔ پنڈت جی نے
شاید اس قتل کے بعد اپنے سر پر گولی لگائی۔ اِس لئے کہ انکا پورا آدھا جبڑا
اُڑ گیا تھا۔ وہ بیہوشی کی حالت میں میڈیکل کالج پہونچائے گئے، جہاں ایک
گھنٹہ بعد وہ مر گئے۔ پنڈت جی مرنے کے پہلے صرف آدھے منٹ کے لئے ہوش میں
آئے تھے اور اُنھوں نے صرف تین مرتبہ "رمو! رمو! رمو!" کے الفاظ دہرائے۔
پولیس تفتیش کر رہی ہے —— اس قتل و خودکشی کے وجوہ کا اب تک
کوئی سُراغ نہیں لگا ہے۔ البتہ پنڈت جی کے کمرے میں مختلف طرح کے سگرٹوں کے
بہت سے ٹکڑے پائے گئے ہیں۔

۱۹۳۷ء

لیڈر

بہرام نگر کا سب سے بڑا میدان آدمیوں سے بھرا پڑا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں کسان جمع تھے۔ ہفتوں سے بیل گاڑیوں، ٹٹوؤں اور بہلیوں کا تانتا بندھا تھا، ہزاروں آدمی پچیس پچیس، تیس تیس، کوس سے پیدل آئے تھے۔ ان میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی، بچے بھی تھے، اور عورتیں بھی۔ بعض کسان اتنے خوشحال تھے کہ اُنکے گلوں میں سونے کے کنٹھے اور کانوں میں "مُرلیاں" پڑی تھیں۔ لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جن کے جسم پر ایک پھٹی پُرانی دھوتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ عورتوں میں کچھ تو سُرخ شہانی ساڑیاں اور بھدبسیل دیہاتی زیور پہنے تھیں۔ کچھ سپید صاف ستھری کنارے دار ساڑیاں زیب جسم کئے تھیں؛ لیکن اکثر کا صندلی رنگ اُنھیں کے ہاتھ کی دھوئی اور رنگی ہوئی گاڑھے کی ساڑی میں روپوش ہو کر افلاس و معصومیت کا داد خواہ تھا۔ بچوں میں بعض کے جسم پر کُرتہ اور دھوتی دونوں چیزیں تھیں، مگر اکثر کے لئے صرف دھوتی ہی تن پوش

تھی، چھوٹے ننھے معصوموں کے لئے تو ان جھگڑوں کی ضرورت ہی نہ تھی، وہ فطرتِ عریاں کی مکمل تصویریں تھے۔

آدمیوں کے اس جنگل کو "مہاشے جی" کے درشنوں کا بڑا شوق تھا اور یہی جذبۂ بے اختیار گلوں کا پھندا بن کر سب کو بہرام نگر کھینچ لایا تھا۔ "مہاشے جی" تھے بھی اسی قابل۔ اپنے صوبے کے بڑے مشہور وکیل، ہزاروں روپے روز کمانے والے وکیل، رہ چکے تھے۔ متعدد شہروں میں بڑی بڑی کوٹھیاں اور عالی شان دوکانیں تھیں۔ مگر "دیس کی سیوا" کے لئے اس مجسّمِ ایثار نے راحت و آسائش کو لات مار دی تھی، انھیں بس ایک ہی دھن تھی۔ جس طرح ہو مظلوم کسانوں کو، ظالم اور خونخوار زمینداروں کے پنجوں سے چھڑانا چاہیئے۔ اس عفریت آب جماعت نے بھوکے کسانوں کی زندگیاں جہنّم بنا رکھی ہیں! —— ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ ایسے کسانوں کو جو واقعی مفلس اور فاقہ کش تھے "مہاشے جی" "نئے اوتار" جان پڑے۔ انھوں نے اُنکے قدم کی خاک کو سرمۂ چشم بنایا اور اُن کے مُنہ سے نکلے ہوئے "شبدوں" کو وید کے منتروں کی طرح دلوں میں جگہ دی۔ وہ "مہاشے جی" کی تقریر کا ایک ایک لفظ اس طرح پی جاتے تھے، جس طرح سوکھی زمین پہلے پانی کی بوندیں جذب کر لیتی ہے۔ جھونپڑے میں رہنے والے کسانوں کو پہلی بار محلوں کا خواب دکھائی دینے لگا تھا!۔

آج بہرام نگر میں یہ بھیڑ بھاڑ اسی لئے تھی۔ "مہاشے جی" کی تقریر تھی۔ بھوکے پیاسے کسان اسی آبِ حیات سے سیراب کیے جانے کی تمنا میں اکٹھا ہوئے تھے۔ بارے "مہاشے جی" آئے۔ بھوں بھوں کرتے، دھول اڑاتے گاؤں کے مطلع کو غبار آلود کرتے، موٹر پر تشریف لائے۔ سیکڑوں کیلوں کے پھاٹکوں میں سے ہو کر، پچاسوں گیندے کے ہار پہن کر، سجدہ کرتے ہوئے دیہاتیوں کو "اشیرباد" دے کر، اونچے چبوترے پر رکھی ہوئی کرسی پر آ کے "براجمان" ہوئے۔ کسان سنگھ کے مقامی سکرٹری نے ایڈریس پیش کیا اور "مہاشے جی" نے "جے جے" کے فلک شگاف نعروں میں تقریر شروع کی۔ تقریر کیا تھی سرمایہ داری کے ہاتھوں کچلی ہوئی انسانیت کے آنسوؤں کا دریا تھا۔ وہ مدوجزر، وہ اُتار چڑھاؤ کہ اللہ تری پناہ! تان اس پر ٹوٹی کہ زمیندار کسانوں کا خون پی پی کر موٹے ہوتے جاتے ہیں، انکا قلع قمع کر دو اُن کا گھر پھونک دو، ان سے زمینداریاں چھین لو۔ یہ اگر بیوی بچوں کا خیال دلائیں تو کہہ دو "تمھاری بیویاں ناگنیں اور تمھارے بچے سنپولیے ہیں!۔ ان موذیوں کے مرجانے میں ملک کی رکشا ہے!

"مہاشے" نے تقریر ختم کی۔ اپنے سفری دفتر میں تشریف لے گئے۔ پرائیویٹ سکرٹری نے چاندی کی کٹوری میں چھٹانک بھر پسا اور گھسا ہوا بادام پیش کیا۔ دو انگلیوں میں وہ اُسے چاٹ گئے۔ پھر آدھ سیر تازہ دودھ پی کر آرام کرسی پر

دراز ہو گئے۔ پرائیوٹ سکرٹری کو تقریر کا خلاصہ اخبارات میں شایع ہونے کے لیے لکھوانے لگے۔ دفعتاً رک کے اُنھوں نے پوچھا۔

کیوں جی آج کوئی خط یورپ سے تو نہیں آیا؟

سکرٹری نے کہا "جی دو آئے ہیں۔ ایک تو پیرس کے بینک کا ہے دوسرا ہالینڈ کا۔"

پوچھا "تم نے پڑھا، کیا لکھا ہے؟"

وہ بولا "جی ہاں۔ پیرس بینک نے تو یہ اطلاع دی ہے کہ اس سال کا سود ملا کر اب اسکے "فکسڈ ڈیپازٹ" میں آپ کے نام گیارہ لاکھ روپے پورے ہو گئے ہیں۔"

مہاشے جی نے کہا۔ "ہوں!" پھر کچھ سوچ کر پوچھا "اور ہالینڈ بینک نے کیا لکھا ہے؟"

سکرٹری بولا "جی اُس نے لکھا ہے کہ آپ کے نام سے تین سال سے جو رقم چلی آتی ہے اُس میں آپ نے نہ تو حسبِ وعدہ اب تک کوئی اضافہ ہی کیا ہے، اور نہ اُس کے متعلق ہدایت کی کہ وہ کس طرح کی کمپنیوں میں لگایا جا سکتا ہے!"

"مہاشے جی" پھر "ہوں" کہہ کے کسی گہرے سوچ میں پڑ گئے۔

سکرٹری نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "محمد پور مل" سے بھی ایک خط آیا ہے۔"

"مہاشے" نے چونک کر پوچھا "کیوں کیا کوئی خاص بات ہے کیا لکھا ہے؟"

سکریٹری بولا "جی مینجر نے لکھا ہے کہ" کانپور اور احمد آباد کی وبا یہاں بھی اب پھیلنے لگی ہے، مزدوروں کا خیال اب آپ کی طرف سے روز بروز خراب ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں" اگر مزدوری نہ بڑھائی گئی تو ہم اسٹرائک کر دینگے۔"

"مہاشے جی" بگڑ پڑے "سخت پاجی ہیں۔ نیچ ذات، چھ آنہ روزانہ میں صرف آٹھ گھنٹے کام لیا جاتا ہے۔ اب انھیں کیا چاہیئے۔ غریب کسانوں کو نہیں دیکھتے کہ بارہ بارہ گھنٹے سخت محنت کرنے پر بھی چھ پیسے روزانہ سے بھی کم ان کی اوسط آمدنی ہے۔"

سکریٹری نے کہا "لیکن وہ کہتے ہیں کہ مل کے مالک زمینداروں سے کئی گنا زیادہ کماتے بھی تو ہیں۔"

"مہاشے جی" بپھر کر بولے۔ "وہ کیا جانیں، زمیندار دیس کا دشمن ہے، اور ہم ——— ہم ملکی صنعت و حرفت کو ترقی دیتے ہیں۔"

سکریٹری نے اپنی مسکراہٹ کو چھپا کر پوچھا "تو میں مینجر کو کیا لکھ دوں؟"

"مہاشے" بولے۔ "بس یہی لکھ دو کہ مجھے کسانوں کی سیوا سے اس وقت فرصت نہیں کہ میں اس طرح کی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ کر سکوں۔ وہ خود مزدوروں کو سمجھائیں کہ ہڑتال کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مہاتما جی نے ابھی حال میں ملوں میں دھرنا دینا عدم تشدد کے خلاف بتایا ہے۔ اگر وہ لوگ نہ مانینگے تو میں مہاتما جی کو چٹھی لکھکر سب مزدوروں سے خفا کرا دونگا۔ پھر وہ کہاں رہینگے!.... ہونہہ!

بڑے آئے اسٹرائک کرنے ! اب اگر ہم ہی لوگوں کے کارخانوں میں ہڑتال ہونے اور دھرنا دیا جانے لگے تو پھر دیس کی رکشا کا کام ہو چکا !"

سکریٹری باہر جانے لگا۔ مہاشے نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک کے کہا " اور دیکھو ! آج ہی بالینڈ بینک کو لکھ دینا کہ میرے روپیوں سے مختلف ملکوں کی اسلحہ ساز کمپنیوں میں حصے خریدے جائیں۔ سمجھے نا ؟ مختلف ملکوں کی کمپنیوں میں اسکے نیچے لکیر کھینچ دینا !"

سکریٹری نے کہا " بہت خوب "

" مہاشے بولے " ہاں بھائی آج کل جنگ کے بادل یورپ بھر پر منڈلا رہے ہیں۔ خوب ہتھیار بنائے اور خریدے جا رہے ہیں۔ بس اب ان کمپنیوں سے زیادہ کسی سے نفع نہیں مل سکتا !"

سکریٹری " بہت اچھا " کہہ کر باہر چلا گیا۔

اور " مہاشے جی " کسانوں کی فلاح و بہبود کی اسکیمیں سوچنے لگے۔

سنہ ۱۹۳۸ء

پیٹ

جیٹھ کی شام تھی۔ لال لال سورج تاریکی کی گود میں اس طرح ڈوب رہا رہا تھا جیسے دہکتا ہوا انگارہ راکھ کے ڈھیر میں آہستہ آہستہ چھپتا ہے۔ زمین بالکل اسی طرح تپ رہی تھی جس طرح تیز بخار کے مریض کا پنڈا جلتا ہے۔ مطلع اس طرح غبار آلود تھا جس طرح سندھ کے ریگستان کے مسافر کا چہرا بالو سے اٹا ہوتا ہے۔ درختوں کی پتیوں اور ڈالوں سے وہی اضمحلال ظاہر ہوتا تھا، جو کولے کی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے چہرے پر شام کو پلٹتے وقت دکھائی دیتا ہے، اور کھیتوں کی زمین سوکھ سوکھ کر اس طرح شگافتہ ہو گئی تھی جیسے دن بھر ننگے پاؤں چلنے والے کسانوں کے تلوے پھٹ جاتے ہیں۔ غرض ذرے ذرے پر ایک مایوسی، ایک تھکن، ایک افسردگی سی چھائی ہوئی تھی ـــــ ہر چیز جلی ہوئی، ہر شے مرجھائی ہوئی، ہر پودا سوکھا ہوا!۔

ایسی فضا میں کملا گھر سے نکلی۔ سترہ اٹھارہ برس کا سن۔ شباب پورے

شباب پر! مگر چہرہ مُرجھایا ہوا، گردن جُھکی ہوئی، رفتار بتاتی تھی کہ خیال ہر قدم پر زنجیریں پہناتا ہے اور انداز کہتا کہ دماغ اُلجھنوں میں پھنسا ہے۔

وہ یونہی سر نہوڑائے گاؤں کی خاک سے بھری ہوئی کچی سڑک پر تھوڑی دُور چلتی رہی، اسکا چپّل، اور اسکی سادی ساڑی کا نچلا حصّہ گرم خاک میں اَٹ گیا۔ اسکے پاؤں نے اس بھوبھل کی حدت کو محسوس کیا۔ وہ غیر ارادی طور پر سڑک کی پگڈنڈی کی طرف مُڑ گئی۔ سامنے باغ تھا، کسی اندھے بھکاری کے دیدوں کی طرح میلا، بے کیف، وحشت دلانے والا۔

کملا اسی باغ میں گھُس گئی، مگر باغ کے اندر گھر کے صحن سے بھی خراب ہوا ملی۔ زہریلی، متعفن، راحت و سکون کی دشمن! کملا نے لب جھپ اسے بھی پار کیا۔ آگے ایک ٹیلا سا تھا، یہاں سے قصبے کے اس کچے تالاب کی حدیں شروع ہو جاتی تھیں جہاں گرمیوں میں چراغ جلنے سے پہلے تک قصبے کے نوجوان اہیر اپنی بھینسوں کو نہلانا فرض سمجھتے تھے۔

گھر سے یہاں تک کملا کے آتے آتے آسمان سے وہ سُرخی بھی غائب ہو چکی تھی جو آفتاب اپنے ترکے کے طور پر روز چھوڑ جاتا ہے۔ اب اُسکی جگہ ایک ہلکی ہلکی، میلی میلی سی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی، تالاب مویشیوں اور چرواہوں سے خالی تھا، درختوں پر چڑیاں گھونسلوں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں اور ہوا میں سوائے دو ایک بھولی بھٹکی ابابیلوں کے کوئے تک اُڑتے نہ دکھائی دیتے تھے۔

کملا ٹیلے پر تو زرا تیز قدم رکھتے ہوئے جلدی سے چڑھ گئی، مگر وہاں پہونچکر وہ ایک ٹھونٹھ کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی اور ہانپنے لگی! ۔ وہ اس لئے نہیں ہانپ رہی تھی کہ اب وہ اپنے خطرناک مقصد کے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس کو اپنے سینے میں دم رُکتا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے ٹھٹھری اور پیٹ کے درمیان کے ایک حصے کو ایک ہاتھ سے دباکر پھنسی ہوئی سانس کے اوپر آنے میں آسانی پیدا کی، مگر مُنہ تک آکر شاید وہ پھر اٹکی، اِس لئے کہ اس نے دو بار زبان ہونٹوں پر پھرائی اور لعاب دہن گھونٹنے کی تین مرتبہ کوشش کی۔ پھر اُس نے ساری کے آنچل سے چہرے کا پسینہ پونچھا، اور تالاب کی طرف جھانک کر دیکھا ——— تاریکی میں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ پانی کی جگہ سیاہی سے بھرا ہوا ہے!۔

وہ ڈرتی، جھجکتی، آگے بڑھی۔ اس طرح بڑھی جس طرح اژدہے کی طرف اُسکی آنکھوں کی کشش سے مجبور ہو کر اسکا شکار بڑھتا ہے۔ بند بند کانپتا ہوا، جوڑ جوڑ بولتا ہوا! ——— لڑکھڑاتی، ٹیڑھے ٹیڑھے قدم رکھتی، وہ کگارے پر آکر ٹھٹکی۔ زندگی بڑی پیاری تھی، موت بہت ڈراونی!۔

کملا کا دل پھر دھڑکنے لگا، تالاب میں گرنے سے پہلے ہی وہ اپنے پسینے سے بھیگ گئی۔ خودکشی کے عزم اور موت کے ڈر میں پھر رسہ کشی شروع ہوئی۔ یہ ذہنی کشاکش کچھ ایسی سخت تھی کہ کملا نے اپنے جسم میں حد درجہ

کمزوری محسوس کی۔ وہ کانپ کر کگارے پر اکڑوں بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھکر آنکھیں بند کئے اُس بحث کو سُننے لگی جو اُسکے دماغ میں جان دینے اور جان نہ دینے کے درمیان جاری تھی۔ ایک طرف بیوگی کی زندگی کی مصیبتیں، ناجائز بچے کے پیٹ میں ہونے کی شرم، ماں باپ، خاندان والوں کا ڈر، اور ہمسنوں ہمجولیوں میں سُبکی کی غیرت، دوسری جانب اپنے ہاتھ سے اپنی جان دیدینے کا بے سود ہونا بیکار اور سود مند زندگی کو محض ایک خیالی شے، گناہ اور بے عصمتی کے لئے کھو دینا اور حال کی بدحالی کی وجہ سے مستقبل درخشندہ سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھنا۔ اور سوسائٹی، رسم پرست، قدامت پسند، برخود غلط سوسائٹی سے، بغیر بدلائے ہوئے دُنیا سے چلا جانا! گویا کالج کا مباحثہ تھا، جہاں دونوں جانب کے طلبا پوری ذہانت، قابلیت کے ساتھ بحث میں لگے تھے اور فیصلہ اسکے سر تھا۔ وہ جانبین کے دلائل سُنتے سنتے گھبرا گئی۔ اُس نے اُکتا کر سر اُٹھایا۔ تالاب نے اسے اپنے دیدۂ بے نور سے گھور کر دیکھا۔ وہ پھر کانپی اور کھڑی ہو گئی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی، غیر ارادی طور پر اسکے پاؤں پیچھے ہٹے۔ قریب کے ٹھونٹھ پر سے اُلو بولا، تالاب کے اِس کنارے پر سے کسی بوڑھے جنادری مینڈک نے "غر، غر" کی۔ اس نے بدحواسی میں اس طرف دیکھا، تالاب سے بہت دُور، کسی دوسرے گاؤں کے ایک جھونپڑے میں ایک دیا ٹمٹما رہا تھا، وہ اُسی طرف مڑ پڑی اور تالاب کے کنارے کنارے چل کر اُسی روشنی پر

نظر جمائے روانہ ہو گئی!

کملا بائی نے اپنی کلکتہ والی عالی شان کوٹھی کی کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا، وہ ایک قیمتی ساڑی میں ملبوس، جواہر نگار زیورات سے مزین شام کی تفریح کے لئے جا رہی تھی، ڈرائیور کو نیچے موٹر لا کر لگا دینے کا حکم دیا جا چکا تھا، اسی کا انتظار تھا۔

موٹر تو نظر نہیں پڑا، مگر مختلف کارخانوں سے چھوٹے ہوئے مزدور اور بابو دکھائی دیئے۔ ہر ایک کے چہرے سے اضمحلال، ہر ایک کی چال میں تھکن، ہر ایک کے کپڑے میلے، کوئی بیڑی پیتا ہوا، کوئی سگریٹ سلگائے ہوئے، کوئی چرٹ منہ میں دبائے ہوئے۔ مگر ہر ایک کے پاؤں سڑک پر ڈھیلے پڑتے ہوئے! ایسا جان پڑتا، پاؤں کئی کئی من کے ہیں اور خود سے اٹھتے نہیں، بلکہ کھینچے جا رہے ہیں۔ ان مایوسوں کے مجمع کو ایک قلی بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، ایک میلی سی پھٹی دھوتی پہنے، ایک بڑا سا جھوا لئے ہوئے۔ وہ ہر بابو جی کے پیچھے تھوڑی دور دوڑتا، بار بار کہتا "مجور بجور! مجور بجور!" اور پھر ایک سے مایوس ہو کر دوسرے کا آسرا ڈھونڈھتا۔

اس منیلے کچیلے مزدور پر نظر پڑتے ہی کملا چونک پڑی۔ وہ ذرا سا مسکرائی، اس نے ملازم کو آواز دے کر حکم دیا کہ اس مزدور کو بلا لائے۔

مزدور بائی جی کے کوٹھے پر آیا، کچھ متعجب، کچھ خوش۔ تعجب اس کا کہ بائی جی کے یہاں اسکے لئے کیا کام ہو سکتا ہے، خوشی اسکی کام ملنے کی ڈھارس تو بندھی، آٹھ گھنٹے کی بے سود تلاش کے بعد دو چار پیسے مل جانے کی امید تو ہوئی!۔

یہاں جو پہونچا تو آنکھ ملتے ہی اُچک پڑا۔ بالکل اس طرح جیسے چلتے چلتے پاؤں میں ببول کا کانٹا گڑ جائے۔ کملا ہنس پڑی۔

"پہچان لیا، منگل؟"

"ارے تم کہاں، کملا؟"

"اور تمہارے کرتوتوں کے بعد ہوتی کہاں؟ گاؤں کے تالاب میں!"

منگل نے سر جھکا لیا۔

کملا بولی "پر میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ تم نے دھوکا نہ دیا ہوتا تو میں بہت سے بہت ایک بیوہ کی طرح رو رو کر، سپید دھوتی باندھ کر، سر منڈوا کر، اپنی سسرال والوں کی جوتیاں کھاتی ہوتی!۔۔۔ مگر آج، دیکھتے ہو یہ سب سامان؟"

منگل نے رُک رُک کے کہا "پر..... نرکھ کملا؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی "نرکھ منگل! ارے پگلے پیٹ سے بھی بڑھ کر کوئی نرکھ ہے!"

۱۹۳۸ء

اندھی جوانی

مُنیا اندھی تھی۔ چار ہی برس کی تھی کہ چیچک ماتا انہیں اور اُسکے باپ کی جان کے ساتھ ساتھ اُسکی آنکھیں بھی لے گئیں۔ ایک وُکھیاری ماں تھی اور گاؤں میں کچھ اسکے باپ کی جوت کے کھیت۔ اسکا باپ جب تک جیتا تھا وہ زمیندار کا کڑا لگان دینے پر بھی اِن کھیتوں میں اتنا پیدا کر لیتا تھا کہ تین جانیں ایک وقت روکھا سوکھا کھا کر گزر بسر کر لیتیں۔ پر جب سے وہ مرا یہ سہارا بھی چھوٹا۔ یہ آسرا بھی ٹوٹا، مُنیا کی ماں خود ہل چلانے سے رہی۔ ساجھی کی ضرورت ہوئی۔ اُس نے بھی مُجل دیا۔ جتنا پیدا ہوا سب کھا گیا، نہ انھیں کچھ دیا اور نہ زمیندار کا لگان ادا کیا۔ نالش، مقدمے کی نوبت آئی اور مُنیا کے خاندانی جوت کے کھیت دو ہی ایک برس میں نکل گئے۔

مُنیا کی ماں نے اب کیونکر بسر کی، اسے مُنیا نہ جانتی تھی، پر گاؤں بھر جانتا تھا کون تھا جو گنگا نہیں نہایا تھا، اور کس نے دو چار پیسے دیکر جھوٹی ہانڈی

کُتوں کی طرح نہ چاٹی تھی ؟۔

مُنیا ان ساری باتوں سے بے خبر، دُھول میں لوٹ پوٹ کے بڑھتی رہی، بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ جوان ہوگئی۔ وہ آنکھ سے تو دیکھ نہیں سکتی تھی، پر ہاتھ سے ٹٹول کے اُس نے یہ بات جان لی تھی کہ اب اسکا جسم پہلے کا سا نہ تھا۔ وہ کچھ بَدل سا گیا تھا، کہیں سے دَب گیا تھا، کہیں کہیں سے اُبھر آیا تھا اور کچھ اس طرح چکنا ہو گیا تھا کہ اسے خود ہاتھ پھیرتے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اسے رہ رہ کے ایک جُھرجُھری سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ بیٹھی بیٹھی آپ ہی آپ مُسکرانے لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی اندر ہی اندر اسکو چھیڑتا ہے۔ کہتا ہے تو گاتی کیوں نہیں؟ تو اُچھلتی کیوں نہیں؟ تو ہنستی کیوں نہیں؟ اسی کے ساتھ اسے اب عورتوں کی پتلی اور سُریلی آواز کی جگہ مردوں کی موٹی اور بھدّی آواز بھلی معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ ماں کے ساتھ جب تڑکے اُٹھ کے جنگل جاتی تو اُس کے ساتھ نہ پلٹتی۔ کسی نہ کسی بہانے سے ضرور رُک جاتی۔ وہ کسی کھیت کی مینڈھ پر اس لئے کان لگائے بیٹھی رہتی کہ کوئی "ہلوا ہا" ادھر سے اپنے بیلوں کو للکارتا، چُمکارتا نکلے۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو وہ اپنی پھوٹی آنکھوں سے اس طرح گھور گھور کے دیکھتی جیسے وہ اسے دیدوں کی جگہ نینوں میں رکھ لینا چاہتی ہے۔

وہ یہ نہ جانتی تھی کہ ہر گزرنے والا اسکی جھلک دیکھتے ہی مُنھ پھیر لیتا تھا صبح صبح اندھی کا چہرہ کون دیکھے۔ جب دو ایک مرد اس طرح گزر لیتے تھے تو سنیا

اپنے دل میں خوشیوں کا سمندر لئے گھر پلٹتی تھی - اور ماں کی گھڑکی اس طرح چپکی سُن لیتی تھی جیسے وہ اندھی ہی نہ تھی بلکہ بہری بھی!

منیا کی ماں بھی بڑبڑا کے چُپ ہو جاتی - کیا کرتی؟ دیکھتی تھی لڑکی سیانی ہو گئی - اِس سے کہیں چھوٹی بچیوں کی سگائی ہوتی تھی، بیاہ ہوتا تھا، گونا ہوتا تھا، بچے بھی ہوتے تھے، پر مُنیا کو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا - اسکے پاس دھرا ہی کیا تھا کہ کوئی اسکی بیٹی سے بیاہ کرنے کی خواہش کرتا؟ ننگی بھوکی، نہ رہنے کی جگہ، نہ جوت کے کھیت، نہ کھانے کے برتن، نہ پہننے کے کپڑے! اس غریبی پر بھی ہو سکتا تھا کہ ذات برادری میں، کہ سُن کے کوئی اسی کا سانگا بھوکا مل جاتا، پر منیا میں ایسا عیب تھا کہ کوئی مفت بھی نہ پوچھتا - اندھی کون بیاہیگا، جی کا جنجال!

وہ کبھی جب بہت گھٹتی تو کسی یار آشنا سے کہتی "میری سُوریا کا کہیں ٹھکانا لگاؤ" وہ مُنیا کو بُلا کر دیکھتا - عورت کیا تھی شروع برسات کی جامن - اتنی ہی کالی کلوٹی - پر اس کالے رنگ کی تہ میں جوانی کی سُرخی بھی دوڑ رہی تھی - یہ سرخی کچھ اس بلا کی تھی کہ وہ ان ہر دیگی مچھوں کا مُنھ لال کر دیتی تھی - وہ اسے اس طرح دیکھنے لگتے تھے کہ مُنیا کی ماں انکے سامنے سے ہٹ جانے کے لئے بیٹی کو ڈانٹ دیتی تھی -

اِس طرح مُنیا کا وہ سن گزر گیا جو ہندوستان میں اُمنگوں کا دن کہلاتا ہے - اِس نے سترھویں میں قدم رکھے ہی تھے کہ ایک دن ارہر کے کٹے ہوئے کھیت سے لوٹھ لانے کے سلسلے میں اسکا بدن "میکو" سے چھو گیا - سٹی کے تیل میں چنگاری

اور پسی ہوئی بارود میں چنگاری دیا سلائی لگی۔ مُنیا کو ایسا جان پڑا جیسے کسی نے اسکے دل کو چٹکیوں سے پکڑ کر لٹو کی طرح گھما دیا۔ وہ پتلی کی طرح تھرا کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

میکو کوئی نوجوان نہ تھا، اسکا سن پچاس سے زیادہ تھا وہ دو بیویوں کو مار چکا تھا۔ وہ آٹھ بچوں کا باپ تھا۔ وہ انجان، انیلا نہ تھا۔ پر وہ بھی مُنیا کے اس طرح زمین پر بھد سے بیٹھ جانے پر گھبرا گیا۔ وہ سمجھا اس اندھی کو کہیں چوٹ آگئی۔

اُس نے پوچھا "کیا ہے رے؟"

مُنیا خود نہ جانتی تھی کہ کیا ہے، وہ کیا بتاتی۔ وہ صرف بن دیدوں والی آنکھیں پھاڑے، مُنہ کھولے اسکی طرف دیکھتی رہی۔ البتہ اس نے ارہر کے گٹھر کو اس طرح زور سے چمٹا لیا جیسے کوئی ماں مدتوں سے گم بچے کو مل جانے پر کلیجے سے لگا لیتی ہے۔

تجربہ کار میکو سمجھ گیا، وہ مُسکرایا، آگے بڑھا، اور مُنیا کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دیکے بولا۔

"اُٹھ رے اندھی۔ اب تو جوان ہو گئی، تو کیا دن دہاڑے سڑک پر لیٹ جائیگی؟"

مُنیا کو اسکی بات بہت بُری لگی۔ پھر میکو کے ہاتھ شرارت کر رہے تھے۔ وہ اُجھی، گھبرائی، سمٹی، جھجکی، جھومی، پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میکو نے مُسکراتے ہوئے ارہر کا گٹھر اُٹھا کر اُسکے سر پر رکھ دیا۔ پھر اُسکا شانہ ہلا کر بولا "آج شام کو پاس والے باغ میں آنا۔ ہم تمھیں بہت اچھا اچھا گانا سُنائیں گے!"

مُنیا لجا کے چپ رہی۔ اس نے چٹکی لی اور کہا "سمجھی؟" مینا نے سر ہلا کر ہامی بھری اور اپنا بوجھ سنبھالتی جلدی جلدی چوپال کی طرف چلی گئی۔

یہ اسی وعدے کا نتیجہ تھا کہ منیا میکو کے ساتھ پکڑی گئی۔

پر وہ اپنا سب کچھ کھو کر بھی خوش تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس خزانے کو وہ زندگی بھر ڈھونڈھتی رہی تھی آج اسکی کنجی مل گئی تھی۔ آج پہلے پہل ایک مرد نے اس سے اچھی اچھی باتیں ہی نہ کیں، بلکہ اُسکا مُنہ بھی چوما، اُسے کلیجے سے بھی لگایا۔ اور اُسکے ساتھ نرم نرم دوب پر ایسا کھیل کھیلا جسکے لئے اُسکی روح بھوکی تھی۔

وہ تو بکسی پڑی تھی۔ پر لوگ میکو کو پکڑ کر مارتے پیٹتے چوپال لے گئے تھے۔ دو ایک نے ایک آدھ ہاتھ خود منیا پر بھی جھاڑ دیے تھے۔ مُنیا کو انکی اس حرکت سے کچھ زیادہ دُکھ نہیں پہونچا۔ اسکا جسم اس سے کہیں زیادہ چوٹ کھانے کا عادی تھا۔ ہاں جو بات کلیجے میں تیر کی طرح جا کر چُبھ گئی وہ یہ تھی کہ میکو پر ہر شخص نے تھوک تھوک کر یہ کہا کہ "پاجی گرا بھی تو کہاں! اندھی، سُور، ڈائن کے ساتھ!"

ماں نے جب یہ بات سُنی تو رسوئی کا جلتا ہُوا چیلا لیکر دوڑی اور بیٹی کا چوٹڈا پکڑ کر خوب ٹھونکا۔ اور ہزاروں ننگی ننگی گالیاں بھی دیں۔

لیکن رات کو جب برادری اکٹھا ہوئی اور اسے بیٹی سمیت ٹاٹ باہر کر دینے کی بات چیت ہونے لگی تو یہی مُنیا کی ماں جھلا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چیخ کر بولی۔ "تمھارے پاس دھن دولت ہے، تمھارے پاس طاقت ہے۔ جو چاہے طے کر لو، پر مجھے اس بات کا جواب دیدو کہ میری سوریا تو اندھی تھی۔ پر تمھارے چہروں پر تو آنکھیں تھیں؟ تم دیکھتے تھے کہ وہ جوان ہو گئی ہے، سیانی ہو گئی ہے۔ تم نے آج تک اسکی سگائی کی

کیوں فکر کی؟ تم نے پہلے کیوں نہ سوچا کہ ایک دن برادری کی ناک کٹے گی؟ پھر اس نے کون سی ایسی بری بات کی؟ میں تو کہتی ہوں وہ تمہاری بیویوں سے اچھی ہے۔ تمہاری بیویاں تمہارے ہاتھ بک کے آئیں۔ تم میں سے ہر ایک نے انکے دام دیے ہیں۔ میری سوریا نے اپنا جسم کسی کے ہاتھ بیچا نہیں۔ اس نے وہ کام کیا جسکے لئے بھگوان نے اسکا جسم بنایا تھا۔ جس میں اسے خوشی ہوئی۔ تم ہی ایمان دھرم سے بتاؤ کہ دونوں میں سے کون اچھا ہے، وہ جو اپنے جسم کو دوسروں کی خوشی کے لئے بیچے، یا وہ جو اپنے جسم سے وہ کام لے جس میں اسکا دل خوش ہو؟"

مردوں نے گردنیں جھکا لیں اور پنچایت بھر پر سناٹا چھا گیا! مگر آس پاس کھڑی ہوئی عورتیں آپے سے باہر ہو گئیں، وہ منیا کی ماں پر ٹوٹ پڑیں۔ "ڈائن! بیسوا! رنڈی! ہرجائی!" کہہ کہہ کے ہر ایک نے اسکے سر کے مٹھی مٹھی بھر بال نوچ لئے۔ پھٹی ہوئی ساری کے چیتھڑے اڑا دئے۔ اور اسے اتنا مارا، اتنا مارا، کہ اسے وہاں سے بھاگنے ہی میں جان بچتی دکھائی دی۔

جب وہ اس طرح لہولہان، گرتی پڑتی جھونپڑے میں پہنچی، تو اس نے دیکھا کہ میکو بیٹھا کراہ رہا ہے اور منیا پاس ہی بیٹھی ہے۔ دونوں کے بیچ میں ایک چینی میں پسی ہوئی ہلدی رکھی ہے، جسے اسکی سوریا میکو کی چوٹ پر تھوڑا تھوڑا کر لگا رہی ہے!

سنہ ۱۹۳۹ء

خاموش! خاموش!

مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ پیش تھا، ملزم کے کٹہرے میں رامو چما
کھڑا تھا، سیاہ چہرے کی ابھری ہڈیاں، دھنسی دھنسی آنکھیں، چھوٹی اور تنگ
پیشانی اسکی ڈر اور لسل کی شاہد تھیں۔ نیچے کا جبڑا کچھ آگے نکلا ہوا تھا۔ اسکی
چہڑان نے چھوٹی ٹھڈی کو قریب قریب غائب کر دیا تھا۔ گردن سر پر بوجھ
ڈھونے کی وجہ سے مضبوط تھی۔ جسم چھریرا تھا اور اس پر جوانی کی آخری چمک
باقی تھی۔ کمر میں جو میلی سی مارکین کی دھوتی تھی وہ گھٹنوں سے اوپر تک پہونچ کر
ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے اسکی سوکھی پنڈلیاں دکھائی دیتی تھیں۔ پاؤں چٹیا تھا
اور اسکی انگلیاں چھوٹی اور موٹی تھیں۔ تمام عمر ننگے پاؤں رہنے سے انگوٹھا انگلیوں
سے ایک انچ کے فاصلے پر زاویہ قائمہ بنا رہا تھا۔ اور تلوے کی کھال پھٹ کر
طرح جگہ جگہ سے پھٹ کر پاؤں کو بھاواں بنا رہی تھی۔

عدالت کے سامنے اسی رامو کی بیوی سوہنی کا بیان ہو رہا تھا۔ یہ ایک

سترہ اٹھارہ برس کی جوان عورت تھی۔ اسکا بھرپور شباب ایک میلی پھٹی ہوئی ساری میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ گھونگھٹ نکالے کھڑی تھی۔ اسکی ناک پر خون آلودہ پٹی بندھی تھی اور اسکی ساری پر جابجا لہو کے دھبّے پڑے تھے۔

سوہنی کے قریب ہی وکیل سرکار کالا گاؤن پہنے کھڑے تھے۔ وہ ایک خاص انداز سے اپنے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے، اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں سے کھیلتے، گاؤن کا دامن برابر کرتے، اور پھر سوہنی سے کوئی ایسا سوال کر دیتے جس سے وہ کانپنے لگتی، اور جس سے وہ شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھی۔

انکے پیچھے ایک کرسی پر رامو کے وکیل صاحب تھے۔ وہ بیچ بیچ میں اپنے مؤکل کے فائدے کی غرض سے لقمہ دیتے اور سوہنی پر اس طرح کے فقرے چست کر دیتے جس سے کمرے میں ایک ہنسی سی پڑ جاتی اور سوہنی کا جی چاہتا کہ کسی طرح زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں دھنس جاتی۔ انکی بغل میں میز کے گرد کرسیوں پر بہت سے وکلا اور تماشائی بیٹھے تھے۔ کچھ لوگ کھڑے تھے، کچھ کمرے کے باہر آجا رہے تھے۔ اور دس کے قریب رامو کے ذات برادری کے لوگ اہلمد کے سامنے والے کونے میں اکٹھے بیٹھے ہوئے ساری باتوں کو ٹکٹکی لگائے سن رہے تھے۔ اُن کے چہروں پر کبھی وحشت کے آثار پیدا ہوتے، کبھی غصّے کے اور کبھی تعجب کے، مگر ان سب پر جو چیز غالب تھی وہ ڈر کی علامت تھی۔ وہ ہر آنے جانے والے کو گوشۂ چشم سے اِس طرح دیکھتے جیسے انھیں اسکا برابر خوف لگا ہوا ہے کہ وہ کہیں

انھیں بھی رآمو کی طرح کٹہرے میں نہ بند کردیں اور اُنکے ہاتھ میں بھی ہتکڑیاں نہ ڈال دیں۔ اس لیے جب کبھی مجسٹریٹ بہادر شور کم کرنے کے لئے میز کو موگری سے کھٹ کھٹاتے تو وہ اپنی سانسیں تک روک لیتے اور اس طرح گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے جیسے وہ بن مانس جو ابھی جنگل سے پکڑ کر لایا ہو، اپنے کٹہرے سے انسانوں کو دیکھتا ہے۔ وکیل سرکار نے اپنے تیل سے چکنے بالوں پر ہاتھ پھیر کر سیاہ گاؤن کا دامن برابر کیا پھر پوچھا۔ "تو جس رات میں یہ واقعہ ہوا، اُس دن تم زمیندار کے یہاں بیگار میں گئی تھیں؟"

سوہنی ۔ "جی ہاں، ہجور"

وکیل سرکار۔ "اور یہ رآمو کہاں تھا؟"

سوہنی ۔ "واسو کے ساتھ پُر چلا رہے تھے"

وکیل سرکار۔ "تو دن بھر پُر چلا رہا تھا؟"

سوہنی ۔ "جی ہاں ہجور"

وکیل سرکار۔ "کیوں کتنے کھیتوں میں پانی بھرنا تھا؟"

سوہنی ۔ "اپنے اور واسو کے دونوں کے کھیت میں"

وکیل سرکار۔ "یہ واسو کے کھیت میں کیوں؟"

سوہنی ۔ "ہجور ایک بیل ہمارا تھا ایک اُن کا"

وکیل سرکار "کیا تمھارے پاس ایک ہی بیل ہے؟"

مجسٹریٹ۔ "و آخران سوالوں کا نتیجہ؟"

وکیل سرکار۔ "جناب عالی میں انکی زندگی کا پس منظر پیش کرنا چاہتا ہوں کہ کتنی تاریک، بھیانک اور دُکھ سے بھری ہے!"

رامو کا وکیل۔ "تو آپ وکیل کی جگہ مصور کے فرائض ادا کرنا چاہتے ہیں۔"

عدالت میں قہقہہ پڑ گیا۔ مجسٹریٹ نے موگری سے میز کھٹ کھٹائی اور کہا "خاموش! خاموش!"

کمرے میں پھر سکوت چھا گیا۔

مجسٹریٹ وکیل سرکار سے بولا۔ "آپ سوال کریں۔"

وکیل سرکار۔ "کیا تمھارے پاس اپنا ہی بیل ہے؟"

سوہنی۔ "جی ہاں ہجور۔"

وکیل سرکار۔ "تو اُس دن تمھارا شوہر اور تمھارا بیل دن بھر کھیت پر رہے اور تم زمیندار کے گھر بیگار میں؟"

سوہنی۔ "جی!"

وکیل سرکار۔ "تو تم کو دن میں کسی وقت تو چھٹی ملی ہوگی؟"

سوہنی۔ "جی ہاں، دوپہر کو گھڑی بھر کے لئے۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے اُس وقت کچھ پکایا نہیں؟"

سوہنی۔ "ہجور گھر میں دال، چاول، آٹا کچھ نہ تھا۔"

وکیل سرکار۔ "تو پھر تم نے نہ خود کھایا اور نہ رامو کو کچھ کھانے کو دیا؟"۔

سوہنی۔ "نہیں ہجور۔ ہم نے گڑ کھا کے پانی پی لیا۔ اور ان کے واسطے ست
اور نمک مرچ کنوئیں پر رکھ گئے"۔

وکیل سرکار۔ "تو اُس نے وہ ستو کھایا؟"

سوہنی۔ "کھاتے نہ تو کیا کرتے، پر گُستا ہوے"۔

وکیل سرکار۔ "غصہ کیوں ہوئے تھے؟"

سوہنی۔ "یہی کہتے تھے۔ جب سے دیکھو تو ستو ہی لاتی ہے۔ تیرے گھر میں
کچھ نہیں رہتا"۔

وکیل سرکار۔ تو تم نے کیا کہا؟"

سوہنی۔ "ہجور ہم نے کہا۔ اس میں ہمارا کیا دوس ہے نہ تم لا کے دیتے ہو
اور نہ رہتا ہے"۔

وکیل سرکار۔ "کیوں کیا تمھارے آنے پر اس نے تمھیں اناج لا کر نہیں دیا؟"

سوہنی۔ "نہیں ہجور۔ بس گھر میں دو من جو، ایک من ارہر تھی۔ اسی سے کام چلایا"۔

وکیل سرکار۔ "کتنے مہینے ہوے تمھارا گونا ہوے؟"

سوہنی۔ "کوئی چھ سات مہینے ہجور!"

رامو کا وکیل۔ "جناب عالی میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ان سوالات سے
عدالت کا بہت سا قیمتی وقت فضول صرف کیا جا رہا ہے"۔

وکیل سرکار۔ "مگر آپ کی سمجھ جیتنی ہے وہ ظاہر ہے!"

عدالت میں لوگ ہنسنے لگے۔ مجسٹریٹ نے میز کھٹ کھٹائی اور کہا "خاموش! خاموش!" پھر سکوت چھا گیا۔

وکیل سرکار۔ "تو ہاں جی سوہنی ـــــ سوہنی ہی تمھارا نام ہے نا؟"

سوہنی۔ "جی"

وکیل سرکار۔ "تو تم اُس دن رامو کو ستو کھلا کے پلٹ آئیں اور زمیندار کے یہاں چلی گئیں؟"

سوہنی۔ "جی ہجور!"

وکیل سرکار۔ "ہوں۔ مگر اتنا اور بتا دو کہ پُرسے پلٹتے وقت رامو نے تم کو کچھ دھمکی دی تھی"

رامو کا وکیل۔ "جناب عالی میں اس سوال کے خلاف احتجاج کرتا ہوں!"

وکیل سرکار۔ "جناب عالی۔ مگر میں اس سوال کا جواب حد درجہ ضروری سمجھتا ہوں!"

مجسٹریٹ۔ "کیوں؟"

وکیل سرکار۔ "اس لیے کہ اس سے ظاہر ہو جائے گا کہ رامو کا یہ فعل پہلے سے سوچا سمجھا تھا یا نہیں؟"

مجسٹریٹ۔ "سوال پیش کیجیے!"

وکیل سرکار۔ "تو بتاؤ سوہنی کہ رامو نے پُرسے تمھارے پلٹتے وقت کیا کہا تھا؟"

سوہنی ۔ "ہجور! انھوں نے کہا اگر آج شام کو بھوجن ٹھیک سے نہ ملا تو تمہاری پسلی توڑ دونگا۔"

وکیل سرکار۔ "پھر تم نے کوئی فکر نہ کی ؟"

سوہنی ۔ "ہاں ہجور۔ جاتے ہی پڑوس میں آٹا دال ادھار مانگا، پر کسی نے نہ دیا۔"

وکیل سرکار۔ "کیا کوئی تم لوگوں پر اعتبار نہیں کرتا ؟"

سوہنی ۔ "ہجور، سب بھوکے ننگے ہیں۔"

مجسٹریٹ ۔ "کیا مدعیہ کا یہ مطلب ہے کہ کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں ؟"

وکیل سرکار۔ "جی ہاں جناب عالی! اور اگر کسی کے پاس کچھ رہا بھی ہوگا تو اس نے دینے سے انکار کر دیا ہوگا۔ بھوک میں انسانیت کے آثار اسی طرح مٹ جاتے ہیں جس طرح سیلاب آنے پر دریا کے کنارے کی سر بفلک عمارتیں۔"

رامو کا وکیل۔ "سبحان اللہ! کیا شاعری فرمائی ہے! کتنی اچھی تشبیہ ہے!"

عدالت میں قہقہہ ہوا۔ وکیل سرکار نے ایک قہر آلود نظر سے اپنے حریف کو دیکھا۔ مجسٹریٹ نے میز کھٹکھٹائی "خاموش! خاموش!"

مجسٹریٹ ۔ "آپ مدعیہ سے سوال کریں!"

وکیل سرکار۔ "بہت خوب جناب عالی ـــــ ہاں جی، تو تم نے پڑوس میں سب سے اناج مانگا۔ مگر کسی نے ادھار نہ دیا۔"

سوہنی ۔ "جی ہجور۔"

وکیل سرکار۔ "پھر تم نے کیا کیا؟"

سوہنی ۔ "ہجور، ہم ہار کے زمیندار کی کوٹھی پر چلے گئے۔"

وکیل سرکار۔ "وہاں شام تک کیا کام کرتی رہیں؟"

سوہنی ۔ "اوکھلی میں دھان کوٹتے رہے۔"

وکیل سرکار۔ "شام کو کیا مزدوری ملی؟"

سوہنی ۔ "ہجور۔ دو پیسے!"

وکیل سرکار۔ "ارے دن بھر کی محنت کے بعد صرف دو پیسے! تم نے زمیندار سے کہا نہیں کہ دو پیسے تو بہت کم ہیں۔

سوہنی ۔ "ہجور دو پیسے تو بیگار میں ملتے ہی ہیں۔ ہم کہہ کے کیا کرتے۔ وہ ہمیں جیادہ دے کے گاؤں کی سرح تھوڑے بگاڑتے۔"

وکیل سرکار۔ "ہوں ——— اچھا تو پھر تم وہ دو پیسے لیکر گھر چلیں۔"

سوہنی ۔ "جی ہاں۔ رستے میں بڑ بھونجے سے اسکے چنے لے لئے۔"

وکیل سرکار۔ "یہ کیوں؟"

سوہنی ۔ "ہجور اپنے اور انکے چبانے کے لئے۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم گھر پہونچیں تو رآمو موجود تھا؟"

سوہنی ۔ "نہیں یہ بعد میں آئے۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے ان کو وہ چنے کھانے کو دیے"

سوہنی ۔ "جی ہاں ہجور۔ بس یہ بگڑ کھڑے ہوے۔ انھوں نے مجھکو گالیاں دیں اور خوب مارا"

وکیل سرکار۔ "تم نے کہا نہیں کہ اس میں میرا کیا قصور ہے"

سوہنی ۔ "ہم نے ان سے کہا کہ ہم نردوش ہیں۔ پر ان پر گُتے کا بھوت سوار تھا۔ یہ سدا ایسے ہی رہے!"

وکیل سرکار۔ "پھر کیا ہوا؟"

سوہنی ۔ "انھوں نے ہم کو کھینچ کر باہر نکال دیا۔ پھر بولے "ہم تارمی کھانے جاتے ہیں، آنے پر بھوجن نہ ملا تو گردن کاٹ کر پھینک دینگے"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے کیا کیا؟"

سوہنی ۔ "ہجور ہم کو بھی گُستا تھا۔ دن بھر دھان کوٹتے کوٹتے ہاتھ تھک گئی تھی۔ اس پر انکی مار پیٹ۔ ہم نے کہا ہم آج جمیندار سے فریاد کہینگے"

وکیل سرکار۔ "تو تم زمیندار کے یہاں گئیں؟"

سوہنی ۔ "ہاں ہجور ہم سیدھے کوٹھی گئے"

وکیل سرکار۔ "تو وہاں زمیندار سے ملاقات ہوئی؟"

سوہنی ۔ "نہیں ہجور!"

وکیل سرکار۔ "کیوں؟"

سوہنی ۔ "جی دوارے پر کنور جی بیٹھے تھے۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے اُنھیں دیکھ کے کیا کیا؟"

سوہنی ۔ "ہجور ہم ٹھٹھک کے کھڑے ہو گئے۔"

وکیل سرکار۔ "کیوں؟"

سوہنی ۔ "ہجور ——— وہ ———"

وکیل سرکار "ہاں ہاں، بتاؤ ——— کہو

سوہنی ۔ "ہجور ——— وہ اچھے نہیں ہیں۔"

وکیل سرکار "کیا بیمار رہتے ہیں؟

سوہنی ۔ "بیماری نہیں۔ ہجور۔ اُنکی بھات نہیں اچھی ہے۔"

وکیل سرکار۔ "کیوں کیا تم کو اُنھوں نے کبھی چھیڑا تھا؟"

سوہنی ۔ "ہجور۔ وہ برابر ہم کو دیکھ کر۔ دانت کٹکٹاتے اور آپ ہی آپ بڑبڑاتے تھے۔"

وکیل سرکار۔ "کیا کہتے تھے؟

سوہنی ۔ "یہی ہجور جو بدمرد استریوں کو دیکھکر کہا کرتے ہیں۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم انکو دیکھ کر ڈر گئیں۔"

سوہنی ۔ "ہاں ہجور۔"

وکیل سرکار۔ "لیکن۔ کیا وہاں اور کوئی نہ تھا؟"

سوہنی ۔ "نہیں ہجور بالکل اکیلے تھے۔"

وکیل سرکار۔ "تو پھر انھوں نے کیا کیا ؟"

سوہنی ۔ "ہجور وہ بولے ارے آج تمھارے کٹھور ہردے میں دیا ہی آگئی !"

وکیل سرکار۔ "کیا اسکے پہلے انھوں نے کبھی تم کو بلایا تھا ؟"

سوہنی ۔ "ہجور وہ برابر یہی تو کہا ہی کرتے تھے کہ کسی رات کو آؤ ہم پر دیا کرو !"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے کہا نہیں کہ میں فریادی کے آئی ہوں ؟"

سوہنی ۔ "ہجور۔ ایسا جان پڑا جیسے ہماری دیہہ کسی نے سی دی۔"

وکیل سرکار۔ "پھر انھوں نے کیا کیا ؟"

سوہنی ۔ "ہجور وہ ہم پر "

وکیل سرکار۔ "ہاں، ہاں، کہو جی، یہ سرکاری عدالت ہے۔ یہاں کوئی بات چھپائی نہیں جا سکتی۔"

سوہنی ۔ "ہجور ۔ وہ ہم کو جھپٹ کے اٹھا لے گئے۔"

وکیل سرکار۔ "تو تم چیخیں چلائی بھی ؟"

سوہنی ۔ "نہیں ہجور "

راموکا وکیل۔ "وہ تو گئی ہی تھی اسی کے لئے چیختی کیوں !"

عدالت میں قہقہہ پڑا۔ سوہنی منھ چھپا کر رونے لگی۔ رامو نے ہتکڑی میں پھنسے ہوئے ہاتھ کٹہرے پر مار کر کہا "ارے یہ ہرامجادی پہلے ہی سب طے کر کے

آئی تھی۔

مجسٹریٹ نے میز پر تین مرتبہ موگری ماری۔ پھر کہا "خاموش! خاموش!"

وکیل سرکار۔ "اب تو جو کچھ ہونے کو تھا وہ ہو چکا۔ رونے دھونے سے فائدہ۔ تم میری باتوں کا جواب دو ——— ہاں تو تم چیخیں چلائیں نہیں!"

سوہنی ۔ "نہیں حضور"

وکیل سرکار۔ "تم نے ان سے ہاتھا پائی بھی نہیں کی!"

سوہنی ۔ "میں ان سے تھوڑی دیر لڑتی اور منتیں کرتی رہی کہ عصمت نہ بگاڑیں پردہ نہ مانے!"

وکیل سرکار عدالت سے ۔ "جناب عالی ممکن ہے کہ میرے دوست رامو کے وکیل صاحب کو مدعیہ کا نہ چیخنا سمجھ میں نہ آتا ہو، تو میں آپ کی اجازت سے دو لفظوں میں اس فعل کی نفسیاتی تحلیل کر دینا چاہتا ہوں۔

جناب عالی۔ مدعیہ ایک جوان عورت ہے گو جس طبقے میں وہ پیدا ہوئی ہے اس میں جوانی کچلی جاتی ہے لیکن پھر بھی فطری طور پر اسکا جی چاہتا ہوگا کہ اسکا شوہر اس سے محبت کی، پریم کی باتیں کرے۔ اسکے حسن کی تعریف کرے۔ اسکا دیوانہ، دالہ و شیدا بنا رہے۔ اسکی جگہ پر رامو کی یہ حالت کہ اُٹھتے گالی اور بیٹھتے جوتے سے تواضع کرنا۔ نہ پیار کرنا نہ محبت۔ ہر وقت حکومت جتانا اور پھر پیٹ بھر کھانے کو نہ دینا!"

رامو کھرا بابا کے بولا، "تو ہم کہاں سے کھانے کو دیں، چوری کریں اِس ہرامجادی کے لیے۔"

مجسٹریٹ نے ہنٹر کھٹ کھٹائی - خاموش!

وکیل سرکار - "تو جناب عالی جیسا میں عرض کر رہا تھا - ایک طرف تو گھریلو زندگی کی یہ بھیانک تصویر - دوسری جانب زمیندار کا لڑکا، بانکا چھیلا چھبیلا - بیس بائیس برس کا نوجوان، اس پر ہر وقت اظہار عشق کرتا ہے - دیوانہ پن کا اظہار کرتا ہے - صورت دیکھتے ہی سرد آہیں بھرتا ہے - آرام و آسائش کا یقین دلاتا ہے - مدعیہ پر غیر ارادی طور پر ضرور اثر پڑتا رہا ہو گا - اس مخصوص دن میں جو کچھ ہوا، وہ جناب عالی نے سُن ہی لیا - دن بھر کی بیگار کے بعد گھر لوٹی، تھک کے چُور تھی، کھانے کا سہارا نہ تھا - اڑوس پڑوس میں اُدھار مانگ چکی تھی وہاں سے ٹکا سا جواب مل چکا تھا - میاں رامو آئے، نہ پیار نہ محبت، نہ تفصیل سے حالات سُنے - بلکہ گالی اور مار سے تواضع کی، گھر سے نکال دیا - بھاگ کے فریاد کے لئے چلی - یہاں تنہائی میں کنور ملے - وہی، جو زبانی ہی سہی مگر اس پہ جان دیتے تھے - انھوں نے اچانک حملہ کر دیا - باز نے چڑیا کی گردن پکڑ لی - کیسے چیخے چلائے - ایک جگہ سے چیخ کے

بھاگی تھی۔ اب کیا یہاں بھی چیخ کر رسوائی کراتی ؟“

رامو کا وکیل۔ ”اور اب جو ہُوا، اس میں تو بڑی نیکنامی ہوئی ؟“

وکیل سرکار۔ ”جی ہاں۔ لیکن اُس وقت وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی وہ چاہتی تھی

بات چھپی رہے۔“

رامو کا وکیل۔ ”تو آپ کے نزدیک کسی بُرے فعل کی بُرائی اُس کے چھپے رہنے سے

کم ہو جاتی ہے ؟“

وکیل سرکار۔ ”جی ہاں، آپ نے اپنی آنکھوں سے کام لیا ہوتا تو دیکھ لیا ہوتا

کہ ہماری پوری سوسائٹی ہی اس اصول پر مبنی ہے۔ بُرا فعل جب

تک ظاہر نہ ہو سوسائٹی کے نزدیک بُرا نہیں ہے۔ خلوت میں جو

جی چاہے کیجیے مگر جلوت میں ثقہ بنے رہیے۔“

عدالت میں فقرے چلنے لگے۔ پھبتیاں کسی جانے لگیں، کسی نے موقع کا

ایک شعر بھی پڑھ دیا۔

مجسٹریٹ نے ڈانٹا ”خاموش! خاموش!“ پھر وکیل سرکار سے کہا

”آپ سوال کریں!“

وکیل سرکار۔ ”تو سوہنی، جب وہ اپنا منھ کالا کر چکے تو اُنھوں نے کیا کیا ؟“

سوہنی۔ ”حضور، اُنھوں نے ساری کے آنچل میں ایک روپیہ باندھ دیا

اور اُٹھ کے چلے گئے۔“

وکیل سرکار۔ "تو تم نے روپیہ لے لیا۔"

سوہنی۔ "ہجور چاندی کا پورا روپیہ تھا!"

وکیل سرکار۔ "کیا تم کو اس سے پہلے کبھی کسی نے کوئی روپیہ نہیں دیا تھا؟"

سوہنی۔ "نہیں ہجور"

وکیل سرکار۔ "ماتا پتا نے گونا کے وقت بھی نہیں؟"

سوہنی۔ "نہیں ہجور۔ بس چلتے سمے پتا جی نے ایک چونی دی تھی۔"

وکیل سرکار۔ "ہوں، تو تم وہ روپیہ لئے گھر پلٹیں۔"

سوہنی۔ "جی۔"

وکیل سرکار۔ "تم نے وہ روپیہ تڑا کے آٹا دال نہیں مول لیا؟"

سوہنی۔ "نہیں ہجور!"

وکیل سرکار۔ "کیوں؟"

سوہنی۔ "ہجور ہم کو بڑا اُکتسا تھا۔ اگر انھوں نے مار نکالا نہ ہوتا تو ہم کا ہیکو کوٹھی جاتے، اور کا ہیکو بے اِجّت ہوتے!"

وکیل سرکار۔ "تو تم نے گھر پلٹ کے کیا کیا؟"

سوہنی۔ "ہجور ہم گھر آ کے کھاٹ پر لیٹ رہے۔"

وکیل سرکار۔ "پھر؟"

سوہنی۔ "اِتنے میں یہ آ گئے۔"

وکیل سرکار۔ "پھر؟"

سوہنی۔ "انھوں نے گالی دے کے پوچھا" بھوجن تیار ہے؟" ہم نے کھونٹ سے روپیہ نکال کر پھینک دیا کہ جاؤ جنس لاکے پکاؤ اور کھاؤ!"

وکیل سرکار۔ "پھر اس نے کیا کیا؟"

سوہنی۔ "یہ ہم سے پوچھنے لگے کہ روپیہ کہاں سے ملا۔ ہم نے جل کر کہہ دیا، تمھاری استری کی اجت کے دام ہیں۔ کنور جی نے دیا ہے۔"

وکیل سرکار۔ "تو یہ بہت جھلایا ہوگا؟"

۔ "ان پر بھوت سوار ہوگیا۔ گڑاسا اٹھا لائے۔ کہنے لگے، میں ابھی کنور کو جان سے مار کے دم لونگا۔

وکیل سرکار۔ "لیکن تمھاری ناک پر چوٹ کیسے آئی؟"

سوہنی نے ایک بار رامو کو دیکھا، سوکھے ہونٹوں پر زبان پھر آئی، وہ سر جھکا کے بولی "بجور انکے ہاتھ سے گڑاسا چھینے میں ایک کونا ناک میں لگ گیا۔"

وکیل سرکار نے اسکو غصے سے دیکھا اور کہا "اس نے تمھاری ناک کاٹنے کی کوشش کی؟"

سوہنی بہت آہستہ سے بولی "نہیں بجور!"

رامو نے ہتکڑی بھرے ہاتھ کٹہرے پر مارے "جھوٹ کہیں کی! ہجور میں نے اسکی ناک کھد کاٹی، اور سب لوگوں نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو میں اس پاجی

کنور کی بھی بوٹی بوٹی کاٹ ڈالے ہوتا۔ اور اب جرا یہاں سے چھوٹ لون تو مجا
چکھاؤں گا! "

مجسٹریٹ نے میز کھٹ کھٹائی، خاموش! خاموش!"

سوہنی۔ "ہجور ہم اب انکے ساتھ نہیں رہینگے۔ ہجور ماتا پتا سمان ہیں۔
ہجور یہ ہم کو مار ڈالیں گے۔ ہمیں پھارک کھتی دلوا دی جائے!"

وکیل سرکار۔ "ہاں ہاں، صاحب بہادر تم کو فارغخطی دلوا دینگے۔ تم ڈرو نہیں،
یہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے"

رامو۔ "پھارک کھتی، تلاک لے تلاک۔ ہرامجادی جیسے ہم ہندو دھرم
میں نہیں ہیں۔ تو سہی کہ اس لوک اور پرلوک دونوں میں تجھکو نہ چھوڑوں!"

عدالت میں لوگ ہنسنے لگے۔ سوہنی نے کانپ کر دونوں ہاتھوں سے
مُنھ چھپا لیا۔

مجسٹریٹ نے میز پر تین بار موگری ماری "خاموش! خاموش! خاموش!"

سنہ ۱۹۳۹ء

روزہ

"میاں آج تیسرا دن ہے کہ روزے پر روزہ رکھ رہا ہوں" میر صاحب نے سوکھی زبان سوکھے ہونٹوں پر پھرا کے کہا:۔

رشید نے پھر ایک مرتبہ ان کی صورت سر سے پاؤں تک دیکھی، زرد چہرا، دھنسی ہوئی آنکھیں، کلّے پر بال کی کھونٹیاں نکلی ہوئی۔ پتلی سی گردن، پتلا سا سینہ، سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں، کسی کی دی ہوئی ایک لمبی، ڈھیلی اور پھٹی ہوئی شیروانی زیبِ جسم تھی۔ پیوندوار میلا گھٹنا بھی کسی دوسرے ہی تھا، اس لئے کہ وہ اتنا اونچا تھا کہ ٹخنے اور پنڈلیوں کا خشک حصہ صاف نمایاں تھا۔ پاؤں میں کینوس کا حد درجہ میلا جوتہ تھا، جس میں سُتلی فیتے کا کام دے رہی تھی۔ اور جو اتنا شکستہ تھا کہ دونوں پاؤں کے انگوٹھے کچھوے کی طرح گردنیں باہر نکالے جھانک رہے تھے۔

میر صاحب کے چلنے سے واقعی معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے روزے پر روزے رکھے ہیں۔ لیکن رشید کے دل میں ان کے اس چلنے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے لکھنؤ

میں رہتے ایک عمر گزری تھی، اسے ہر طرح کے سائلوں اور بھیک مانگنے والوں کا
تجربہ تھا۔ وہ ان لوگوں سے بھی واقف تھا جو آپ کو تانگے پر دیکھ کر "ارے لے وہ
سرکار جو تانگے پر جا رہے ہیں" کہہ کر کبھی سلام کر کے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو
بھی جانتا تھا جو لنگڑے لولے بن کر آپ کی ہمدردی کا اندازہ کرنے نکلتے ہیں، اُن
لوگوں کو بھی پہچانتا تھا جو آپ کو دوستوں کے مجمع سے الگ لیجا کر اس طرح آہستہ
سے بھیک مانگتے ہیں جیسے آپ سے انکی بڑی گہری چھنتی ہے۔ اور وہ کوئی خاص
راز کی بات آپ سے کہہ رہے ہیں۔ اور اُن لوگوں کا بھی تجربہ رکھتا تھا جو ہر سال
کھیت کھلیان سے فراغت حاصل کر کے لکھنؤ تشریف لاتے ہیں، اور ہر مہینے میں
کم سے کم تیس روپیہ کا منی آرڈر گھر بھیجتے ہیں۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ میر صاحب بھی اسی
آخری قسم کے فقیروں میں سے ہیں۔

اس نے پوچھا۔ "میر صاحب! کیا آپ سچ مچ روزے سے ہیں؟"

اُنھوں نے فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لا کر کہا۔ "میں بھلا حضور سے جھوٹ
بولونگا۔ رمضان کا مہینہ ہے، گرمیوں کے دن ہیں اور پرایا دیس۔
سید ہوں اور مسافر....."

رشید نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو کیا آپنے سچ مچ کل کچھ بھی نہیں کھایا تھا؟"

میر صاحب آزردہ لہجے میں بولے۔ "حضور کے سر عزیز کی قسم کھاتا ہوں
کہ پرسوں سے ایک کھیل اُڑ کر منھ میں نہیں گئی، بس پانی سے افطار کرتا ہوں اور

پانی ہی کی سحری کھاتا ہوں۔"

رشید نے کہا۔ "تو پھر آپ کو روزہ رکھنے ہی کی کیا ضرورت تھی؟"

میر صاحب بہت ہی متانت سے شکایتانہ انداز سے بولے۔ "آپ بھی میاں مذاق کرتے ہیں۔ ہم غریبوں کی دُنیا ہی کون سی اچھی ہے، کہ اب عاقبت بھی خراب کرلیں!"

رشید، میر صاحب سے کچھ اور پوچھنے والا ہی تھا کہ حاجی صاحب آگئے۔

آپ اگر ان کے نام سے مرعوب ہو گئے ہوں تو اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ رشید کے ملازم "کلو" کا خطاب ہے۔ یہ نماز روزے کے معاملے میں کٹر قسم کے مسلمان ہیں، اور ماشاءاللہ ان کو قرآن کے ڈیڑھ پارے بھی یاد ہیں۔ لڑکوں نے انکی سچائی، سادگی اور لمبی داڑھی دیکھ کر کسی سال جون یا جنوری میں انھیں "حاجی صاحب" کا خطاب عطا کر دیا۔ یہ ان کے اوپر کچھ ایسا ٹھیک اُترا کہ اپنے پرائے سب لوگوں نے انھیں اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا۔

حاجی صاحب کا حُلیہ، انکے اصلی نام ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایسا پختہ رنگ ہے کہ دن میں کئی بار غسل و وضو کے سلسلے میں دُھلنے کے باوجود اسکی چمک میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ چھریرا بدن اگرچہ کمزور ہے، لیکن حاجی صاحب کی پھُرتی کا باعث بھی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ صبح پانچ بجے سے رات کے بارہ بجے تک یا تو وہ طرح طرح کے کاموں میں مشغول رہیں گے۔ یا نماز و تہجد میں محو۔ مزاج ایسا پایا

ہے کہ پیر پیمبروں ہی کو ہلا ہو گا۔ نہ کسی سے لڑنا، نہ تُو تُو مَیں مَیں، اور نہ دانتا کل کل، ہر ایک سے دوستی، ہر ایک سے محبت اور ہر ایک پر اعتبار۔ وہ کمزور انسان کی صورت میں صرف دو ہی وقتوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو اپنی بیوی سے باتیں کرتے وقت، اور دوسرے اپنا پیسہ صرف کرتے وقت۔ مگر اس کمزوری کا پہلا موقع تو حاجی صاحب نے سرے ہی سے غائب کر دیا۔ یعنی وہ شادی کرنے پر بھی بن بیاہے ہی رہے۔ اور بد دماغ بیوی جوتے لات سے عاجز آکر طلاق لیکر بیٹھ رہی۔ البتہ دوسرا موقع باوجود حاجی صاحب کی کوششوں کے سال میں دو چار بار پیش آ ہی جاتا ہے۔ انکا انداز یہ ہے کہ وہ اپنا پیسہ حرام اور ناجائز ہی نہیں سمجھتے! بلکہ اسے چھپے کونوں سے نکالنا اور دوسروں کو ضرورت کے وقت قرض دینا بھی شدت کے ساتھ مکروہ جانتے ہیں۔ تنخواہ ملی نہیں کہ حاجی صاحب نے اسکا منی آرڈر اپنی ماں کے پاس بھیجا نہیں۔ اس میں دیر نہیں ہو سکتی، جہاں مہینہ کی پہلی تاریخ سے دو چار دن بھی ٹلے، اور حاجی صاحب پریشان ہو گئے، بار بار ڈیوڑھی پر جا کر "بیوی" سے فریاد کرینگے۔ "اے سرکار آخر تنخواہ کیوں نہیں ملتی؟" بچوں کی طرح مچلیں گے، روٹھیں گے، ضد کرینگے، اور بالآخر تنخواہ لیکر اور اُسے پوری کی پوری ماں کے نام روانہ کر کے دم لیں گے۔

رشید اور اُس کے گھر والے سب ان کا لحاظ کرتے اور ڈرتے ہیں۔ اس لئے کہ حاجی صاحب ان سب کے اچھے آدمی ہی نہیں ہیں بلکہ سب کے خداوند نعمت بھی ہیں

یعنی کھانا وہی پکاتے ہیں۔ وہی وہاں مثل ہے "جس کے ہاتھ میں ڈوئی، اُسی کا سب کوئی" اس لئے اچھے بھلے نمک حلال آدمیوں کی طرح رشید اور اُس کے متعلقین کو حاجی صاحب کو خوش رکھنا ہی پڑتا ہے۔

رشید، میر صاحب کو آنکھوں میں اچھی طرح تول کر انھیں کچھ سخت سُست سُنا کر دُھتکار بتانے والا ہی تھا کہ یہی حاجی صاحب ہاتھوں میں پُھلکیوں کا گیلا بیسن بھرے ہوئے آ گئے، اور میر صاحب بولے "آپ ٹھہرئیے میں ابھی آپکے لئے کچھ لایا"۔

حاجی صاحب تو باورچی خانے کے مالک ہی ہیں، انکو کسی سے پوچھنے گچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اِس لئے وہ رشید کے مال کی بہت کشادہ دلی سے خیرات بانٹنے چلے تھے کہ رشید نے ان سے مسکرا کر پوچھا "کیوں بھئی، کیا ابھی سے تم نے افطار تیار کر لی ہے؟"

وہ بولے۔ "جی ہاں میاں! آج کل تو ایک بجے دن سے لگا نہ لگا دو، تو مغرب سے پہلے سب کچھ تیار کیوں کر ہو؟"

رشید کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ حاجی صاحب باورچی خانے میں گُھس گئے، وہ ایک کارِ خیر کی نیت باندھ چکے تھے، رشید کی باتیں انکی یکسوئی دماغ میں خلل انداز ہو رہی تھیں، رشید ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ چُپ ہو رہا۔

میر صاحب کے چہرے نے اس درمیان میں کئی رنگ بدلے، پہلے تو اس پر التجا اور لجاجت کی خشکی تھی، پھر اس پر امید کی سُرخی دوڑی۔ حاجی صاحب سے رشید کی باتوں نے اس سُرخی کو ذرا مایوسی کی ہلکی زردی میں بدلا۔ مگر حاجی صاحب کے

اندر چلے جانے نے اس زردی میں پھر ایک چمک سی پیدا کر دی۔ اب وہ دروازے کی طرف اس طرح دیکھ رہے تھے، جس طرح کھونٹے سے بندھا ہوا جانور چارا لائے ہوئے آدمی کو دیکھتا ہے۔ ان کے سوکھے نتھنے بار بار پھیلتے اور سمٹتے تھے۔ ان کے جسم میں ایک خفیف سی تھرتھراہٹ تھی، اور اُنکی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے جھلک رہے تھے۔ انکی اس حالت میں شاید اس ہلکی سی مُسکراہٹ نے اضافہ کر دیا تھا۔ جو رشید کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔

بارے حاجی صاحب ایک پلیٹ میں کچھ رکھے ہوئے اور اسے اپنی میلی قمیص سے ڈھانکے ہوئے لیکر نکلے۔ میر صاحب انکی طرف بڑھے، رشید نے بھیک دینے والے اور بھیک مانگنے والے دونوں کو سزا دینے کی غرض سے کہا۔ "حاجی پلیٹ یہاں لاؤ"۔ حاجی صاحب کا بڑھا ہاتھ رُک گیا۔ میر صاحب کا پھیلا ہوا ہاتھ لٹک گیا۔ حاجی صاحب نے رشید کو گھبرا کر دیکھا۔ وہ رشید کا مال دریا دلی سے خیرات کرنے میں آج پہلی دفعہ ٹوکے گئے تھے۔ میر صاحب نے رشید پر ایک خوف زدہ نظر ڈالی۔ ہلتی ہوئی بھیک ہاتھ سے جاتی دکھائی دی، رشید پھر مُسکرایا۔ اُسے آج ان غریبوں کے ستانے میں سرمایہ داروں کا سا مزا آرہا تھا۔ حاجی صاحب نے اسکے سامنے پلیٹ لاکر رکھدی۔ دو سُہال، دو پوریاں، آٹھ پھلکیاں، دو سموسے، تھوڑا سا قیمہ اور مٹر اور چنے کی گھگھنیاں۔ پوری افطار کا سامان تھا۔

رشید کو اس سخاوت پر غصہ تو آیا، مگر وہ اُسے پی گیا بولا "ہوں!.....

اچھا دے دیجیے!"

میر صاحب نے جلدی سے شیروانی کا دامن اُٹھا کر پھیلا دیا۔ حاجی صاحب نے پلیٹ اُٹھا کر کہا۔ "نہیں میر صاحب، اس طرح کہاں لے جائیے گا۔ دیکھیے میں کوئی برتن لاتا ہوں۔"

رشید کے قریب پلیٹ رکھکر وہ اندر پھر چلے گئے۔ اور میر صاحب اس بھری پلیٹ کو اسی نظر سے دیکھنے لگے، جس نظر سے بھوکا کتا قریب رکھے ہوئے چھیچھڑے کو دیکھتا ہے۔ رشید پھر مسکرا رہا تھا، میر صاحب اِس مسکراہٹ سے اِس طرح گھبراتے اور اُلجھتے تھے کہ ان کے جسم میں بار بار ایک جھرجھری سی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے اب انھیں لرزہ آنے والا ہی ہے۔

بارے حاجی جی مٹی کی ایک بڑی سی رکابی لیکر پلٹے۔ اُنھوں نے بھری ہوئی پلیٹ اس رکابی میں پلٹ دی۔ میر صاحب نے جلدی سے افطار اُٹھالی اور چل دیے۔"

رشید نے حاجی صاحب سے کہا۔ "اگر شام تک اسی طرح کے دو چار فقیر آگئے تو تم تو ہم لوگوں کی ساری افطار ہی ختم کر دو گے۔"

وہ چونک کر بولے "نہیں میاں! مگر میر صاحب پر مجھے کچھ ایسا رحم آیا کہ نہیں رہا گیا۔ پرایا دیس، پہاڑ کے سے دن، اور اس پر حضور روزے پر روزہ!"

رشید نے ہنس کر پوچھا۔ "تم کو انکی باتوں کا یقین آگیا؟"

اُنھوں نے کہا۔ "بھلا رمضان شریف میں بھی کوئی اسطرح جھوٹ بولیگا حضور۔"

رشید نے انکے بھولے پن پر مسکرا کے کہا۔ "اچھا تو میر صاحب ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہونگے۔ تم زرا انکا پیچھا کر کے دیکھو کہ کیا کرتے ہیں۔"

حاجی صاحب، رشید کو اپنے چہرے مہرے سے حد درجہ بیوقوف سمجھتے ہوئے میر صاحب کے پیچھے لپکے۔ تھوڑی دیر بعد پلٹے۔ کچھ خفا، کچھ نادم۔"

رشید نے پوچھا "کیوں بھئی کیا ہوا؟"

وہ کہنے لگے "میاں آپ سچ کہتے تھے۔ گلی کے موڑ پر جو نل ہے۔ اسکے پاس زمین پر اکڑوں بیٹھے جلدی جلدی افطار اُڑا رہے تھے۔ مجھے جو دیکھا تو سب سمیٹ کر منہ میں بھر لیا۔ اچھو ہوتے ہوتے بچا۔ جب پائپ سے چلو لگا کر غٹ غٹ پانی پی لیا اور گلے میں پھنسا ہوا نوالہ حلق سے اتر گیا تو میں نے پوچھا "مرد خدا اس قدر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بولے "ہونہہ! جھوٹ بولا! جیسے روزے اور فاقے میں بڑا فرق ہی ہے؟" میرا جی چاہا، ایک تھپڑ دوں۔ مگر وہ جلدی سے گلی کے اندر بھاگ کے بولا "ارے جاؤ بھی حاجی جی، اس طرح جھوٹ نہ بولتا تو تمھارے کنٹک مالک کی افطار کیسے چکھنے کو ملتی!"

رشید بیساختہ ہنس پڑا۔ حاجی صاحب جھنجھلاتے ہوئے باورچی خانے میں چلے گئے۔

سنہ ۱۹۳۹ء

ردِّ عمل

مقررہ کی تقریر میں آفت کا جوش اور بلا کی گرمی تھی۔ معلوم ہوتا دہکتے ہوئے انگارے ہیں جو لعل ایسے لب سے نکل رہے ہیں اور جلتے ہوئے پھول ہیں جو انار جیسے منھ سے چھوٹ رہے ہیں۔ مقررہ کے قد و قامت کی موزونی، لباس و غازے کی دلربائی، شیریں آواز کا زیر و بم اور حرکات و سکنات کی دلاویزی یوں ہی حشر بداماں تھی، اس پر موضوع بحث کی دلاویزی نے اور بھی قیامت برپا کر رکھی تھی۔ بس ایک تلاطم تھا، ایک ہنگامہ تھا، ایک طوفان تھا جو نوجوان دلوں کی چولیں ہلاتا اور اعصاب و جذبات میں زلزلہ ڈال جاتا تھا۔ مجمع بھی تھا، یونیورسٹی اور کالج کے طلباء اور طالبات کا، لڑکے قطار در قطار تو لڑکیاں لشکر در لشکر! ان سب کو مسز "رتنا پیتم" کا نام کھینچ لایا تھا۔ وہ انکے لئے اجنبی نہ تھی۔ آج سے دو ہی برس پہلے تو وہ انکی یونیورسٹی کی مشہور طالبات میں سے تھی۔ اسکے باپ شہر کے سب سے کروڑپتی تھے اور "رتنا" کے لئے اس زمانے میں تمام وہ سامان آسائش و آرائش

مہتیا تھے۔ جو دولت کی بہتات ایک ادنیٰ اشارے پر موجود کر دیتی ہے۔ وہ اس قارون وقت اور ہندوستانی روشچائلڈ کی اکلوتی بیٹی تھی، اور انکے چودہ شکر اور کپڑے کے کارخانوں کی واحد وارثہ!۔ رتنا دس ہی برس کی تھی کہ اس کی ماں سورگ باشی ہوگئیں۔ سیٹھ چندر جی نے بیوی کی محبت بھی بیٹی کی طرف منتقل کر دی، اسے آنکھوں کا تارا بنایا اور بڑے ناز و نعم سے پالا۔ اسکی ہر ہٹ اور ہر ضد پوری کی، چشم و ابرو کے اشارے پر چلے۔ اور چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی نہ ٹالی۔ غرض رتنا کے سن کے ساتھ ساتھ انکی اطاعت ہی نہ بڑھتی رہی بلکہ اسکی تعلیمی ترقی اور اپنی جہالت کی وجہ سے اسکا ڈر بھی دل میں گھر کرتا گیا۔

مگر یہ حالت رتنا کے ایف، اے، پاس کرنے تک رہی۔ ادھر رتنا یونیورسٹی میں داخل ہوئی اُدھر سیٹھ جی کے بوڑھے خون میں جوش آیا۔ اُنھوں نے یار دوستوں کے کہنے سے دوبارہ گھر بسایا۔ نئی سٹھانی رتنا ہی کے سن و سال کی تھیں، اِس لئے اُنکے گھر میں براجتے ہی اُنکے اور رتنا کے درمیان ماں بیٹی کی محبت کی جگہ سوکنوں کی جلن پیدا ہوگئی۔ سیٹھ جی کچھ دنوں تو برابر تولنے کی کوشش کرتے رہے، مگر آہستہ آہستہ بیٹی ہلکی اور بیوی بھاری پڑتی گئی۔ وجہ بھی ظاہر تھی۔ رتنا لخت جگر، نور نظر، دل کی ٹھنڈک سہی۔ لیکن اس سے جسم کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ اسکی سبیل تو نئی سٹھانی ہی کے پاس تھی۔ اور وہ تھیں کہ ذرا ذرا سی بات پر آنسوؤں کے جل تھل بہا دیتی تھیں۔ اس سیلاب

میں سیٹھ جی کے سارے عزائم انصاف و عدل تنکے کی طرح بہ جاتے تھے۔ اور وہ غزالی آنکھوں کے آنسو خشک کرتے کرتے رتنا کو انھیں کے نینوں سے دیکھنے لگتے تھے۔

رتنا کی وہی حالت تھی جیسے کسی شہنشاہ سے اسکا راج چھین لیا جائے، جہاں وہ اکیلی حکمرانی کرتی تھی وہاں وہ روز بروز محکوم بنتی جارہی تھی۔ دو چار بار اس نے سلب شدہ اختیارات کے واپس لینے کی کوشش کی، مگر

"دو دل یک شود بشکند کوہ را"

سیٹھ اور ٹھانی نے اسے غاصب ثابت کر کے شکست دے دی۔ چنانچہ اب اسے گھر کاٹنے لگا۔ اور اس میں گھومنے پھرنے اور سوسائٹی کی تتلی بننے کی خواہش بڑھنے لگی۔ ساتھ ہی باپ کی شادی نے غیر شعوری طور پر اسکے نیم خفتہ اعصاب کو بیدار کر دیا اور اس میں اپنے لئے "بر" کی تلاش و جستجو کی رغبت پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے ساتھی طلبا پر اس حیثیت سے نظر ڈالنے لگی کہ ان میں سے کون کفو بننے کے لائق ہے۔

نظرِ انتخاب ٹھہری یتیم پر!

یہ ذات کے برہمن تھے، اور گھر کے غریب۔ ذہن بھی کچھ اچھا نہ تھا، رٹ رٹ کے امتحان تیسرے درجے میں پاس کر لیتے تھے۔ مگر جسم بہت سڈول تھا، صورت شکل اچھی تھی، اور خاموش اور سنجیدہ ہونے کی وجہ سے جنس

مخالف کے لئے خاص کشش کے مالک تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رتنا انکی ذات برادری کی نہیں، کھتری ہے، یہ ہیرا انکی پیتل کی انگوٹھی پر ٹھیک نہیں بیٹھ سکتا۔ لیکن جب رتنا خود چاہے، صیاد خود صید بننے کی کوشش کرے، رانی خود بڑھ کر گلے میں ہار ڈالے تو کیونکر بس چلے؟۔ اس لئے وہ محبت کی شکست میں پھنس گئے اور بوڑھی ماں اور گاؤں والے پھونس کے جھونپڑے ہی کو نہ بھولے، بلکہ پیپل کے تنے کے پاس رکھی ہوئی مورتی کی جگہ مدہوش شباب رتنا کی پرستش کرنے لگے۔ پھر بھی رتنا کا دولتمند ہونا اور خود کا بالکل قلاّنچ ہونا کبھی کبھی مردانگی کا ٹھوکا دیتا تھا۔ لیکن جذبات کے تلاطم نے زیادہ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اور وہ خوشی خوشی غیرت و حمیت کی قربانی کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ اور مستقبل میں دیش کی سیوا کے منصوبے بھی پریم پرپھینٹ چڑھا بیٹھے۔

رتنا نے اپنے انتخاب اور اپنی پسند کی اطلاع سیٹھ جی کو دے دی۔ وہاں نئی سٹھانی کے زیر اثر جس طرح کھویا ہوا شباب پلٹا تھا۔ اسی طرح اصابت رائے بھی عود کر آئی تھی۔ اُنھوں نے ذات پات کے پھیر میں پڑ کر اس شادی کی مخالفت کی۔ اور یہ حکم دینے کی جرأت کر ڈالی کہ رتنا اپنے پیارے پنڈت سے ملنا تک ترک کر دے۔ بس رسہ کشی شروع ہو گئی، یونیورسٹی کی نوجوان پارٹی، پیتم پریم کی حامی بنی، یہ رتنا کی ٹیم ہوئی۔ دوسری جانب کھانستے ہوئے سیٹھ جی اور بل کھاتی ہوئی سٹھانی نے ٹیم بنائی۔ دونوں طرف سے زور لگنے لگے۔ مخالفتیں

بڑھتی گئیں۔ یہاں تک کہ سیٹھ جی نے خفا ہو کر دھمکی دی کہ اگر رتنا نے کہا نہ مانا تو انکی دولت سے محروم کر دی جائیگی۔ بس اسکو صرف وہی پچاس ہزار مل سکیں گے جو اس کے نام سے بنک میں ہیں۔

سیٹھ جی کی اس دھمکی نے انکی محبت میں جذبۂ قربانی کا اضافہ کر دیا۔ رتنا کے اخلاص کی جانچ کے لئے یہ کسوٹی اچھی ہاتھ آئی۔ پریم کی غیرت کا ڈنک بھی ٹوٹ گیا۔ جہاں کروڑوں کی بات چیت ہو، وہاں ہزار کوڑیوں کے برابر دکھائی دیتے ہیں، پریم کا پس و پیش ختم ہو گیا۔ رتنا کسوٹی پر پوری اتری اور چند ہی دنوں میں دونوں کی "سول میرج" ہو گئی۔

اِس محبت کی شادی کو دو برس ہو چکے تھے۔ پریم جی "پرنس کنسورٹ" کی حیثیت سے تعلیم نامکمل چھوڑ کر رتنا کے ساتھ دیس بدیس کی سیر کر آئے تھے۔ اب جبکہ نقد پونجی ختم ہونے کے قریب تھی تو دونوں شہر پلٹے تھے۔ آج رتنا کا پہلا پبلک لکچر تھا موضوع تھا "ہماری شادیاں"۔

رتنا نے اپنی پسند کی شادی کی وہ تعریفیں بیان کی تھیں، اور خوشیوں اور مسرتوں کی وہ سُندر تصویر پیش کی تھی کہ ہر نوجوان لڑکی اور لڑکا جنت کے سارے مزے اسی دُنیا میں لوٹنے کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگا تھا۔ ساتھ ہی رتنا نے والدین کے دباؤ، زبردستی، جبر، تشدد اور ظلم کا وہ بھیانک مرقع پیش کیا تھا کہ سارے طلبار اور طالبات انھیں "ہُون" اور "مغل" سے بھی زیادہ سفاک اور بے رحم سمجھنے

لگی تھیں۔ اس نے آخر تقریر میں انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ اگر زندگی کا سب سے اہم کوئی مسئلہ ہے تو وہ پریم اور صرف پریم ہے! ان میں سے ہر ایک کا دل خالی کٹورے کی طرح پریم کی پیاس میں کھنکنے لگا تھا۔ انکا بس نہ چلتا کہ وہ کس طرح جلد سے جلد اس جام خالی کو جنس مخالف کی کسی فرد کی چاہ سے بھر لیں۔ وہ مستقبل قریب ہی میں اس آبحیات سے سیراب ہونے کی امید میں ابھی سے اپنے عنابی ہونٹ چاٹنے لگی تھیں۔ وہ اس آنے والی پُراز مسرت زندگی کے خیال ہی سے بار بار سرشار ہو کر جھومنے لگی تھیں۔ انکی آنکھوں میں ابھی سے خمار سا چھایا جاتا تھا۔ انکے ہاتھ پاؤں ابھی سے ٹوٹنے لگے تھے۔ وہ مقررہ پر نظریں جمائے ایک ایک لفظ کانوں سے پیے جا رہی تھیں۔ رتنا کہہ رہی تھی ——

"میں آخر میں پھر ایک بار دُہراتی ہوں، پریم ہی سب کچھ ہے۔ پریم ہی بھوک ہے، پریم ہی پیاس۔ پریم ہی امارت ہے، پریم ہی سب سے بڑی دولت اگر کسی کے پاس یہ نہیں ہے تو کروڑپتی ہو کر بھی کنگال ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ ہے تو کنگال ہو کر بھی مالامال ہے! یہ اگر ہے تو کوئی دُکھ دُکھ نہیں، یہ اگر نہیں ہے تو کوئی سُکھ سُکھ نہیں ہے۔ لوگ کسانوں کو دُکھی بتا کر اُن کے لئے لڑتے ہیں، لوگ مزدوروں کو مصیبت زدہ بتا کر اُنکے لئے جنگ کرتے ہیں، لوگ سرمایہ و دولت کی غیر مساوی تقسیم کو بُرا بھلا کہہ کر اسکے سُدھار کے لئے آمادۂ پیکار ہوتے ہیں، لوگ دیش اور وطن کو غلامی سے چھڑانے کے لئے آزادی کا مالا جپنے لگتے ہیں لیکن

مَیں کہتی ہوں سب سے بڑی آزادی ہے پریم کی آزادی، سب سے پہلے اسے جیتو، اسکو سوسائٹی کے، دھرم کے، دیش کے پنجے سے آزاد کراؤ، پھر آزادی ہی آزادی ہے! ملک کی آزادی ایک مادی چیز ہے، پریم کی آزادی روح آتما کی آزادی ہے۔

اِس لئے بہنو، بھائیو! میری بات گرہ میں باندھ رکھو، پریم کرو، پریم! تم جانتے ہو، میں نے کروڑوں روپے پر اسی لئے لات ماردی! مگر اپنی پسند، اپنے انتخاب سے نہ ٹلی! تعلیم چھوڑ دی، خاندان چھوڑ دیا، یہاں تک کہ برادری ہی نہیں بلکہ دیس چھوڑ دیا، پر اسکو نہ چھوڑا! جس سے مَیں پریم کرتی ہوں۔ مَیں آپ لوگوں کو یقین دلاتی ہوں کہ مجھے اس وقت تک کبھی بھولے سے بھی یہ خیال نہ آیا کہ مجھے پریم کی قیمت زیادہ دینا پڑی۔ سچ مانیے میری گرہست زندگی کی ہر سانس سورگ کی رچناؤں سے بھری پڑی ہے! مجھے وہ آنند ہے کہ جو بڑے بڑے دھنوانوں نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا! میں اپنے کو ہر وقت مبارکباد دیتی ہوں کہ مَیں نے پریمی پیتم کا سا سوامی اور سرتاج اپنے لئے چُنا! اور یہی آشا ہے کہ انھیں کے پوتر چرنوں میں پوری زندگی، یہ پورا جنم بسر کردوں! میری پیاری بہنو، اور میرے پیارے بھائیو! بھگوان تم سب کو اسی طرح کا سکھی جیون دے۔"

ہال تالیوں کی آواز اور "براوو! شاباش! مرحبا!" کی صدا سے گونجنے لگا۔ سامعین میں سے ہر ایک، سوائے ایک شخص کے جو پچھلی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا، چیخ رہا تھا۔ جلسے کے ختم ہونے پر جب رتنا بہت سے سلام قبول

کرتی موٹر کی طرف چلی تو وہ شخص بھی گردن جھکائے ساتھ ہولیا، یہی ان کا "پرنس کنسورٹ" میتم تھا!۔

راستے میں میاں بیوی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی، دونوں اپنی اپنی جگہ بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ لیکن گھر پہونچتے ہی میتم ایک کمرے میں جسکے پھٹے ہوئے کوچ اور ٹوٹی ہوئی گدّے دار کرسیاں بتا رہی تھیں کہ ڈرائنگ روم ہے، گھس گیا۔ اور وہاں داخل ہوتے ہی ایک کوچ پر گر کر بیساختہ قہقہے لگانے لگا۔ رتنا پیچھے رہ گئی تھی اس نے کمرے میں آتے ہی میاں کو جو اس طرح ہنستے دیکھا تو اسکا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ اسے بڑے غصّے سے گھورنے لگی۔ میتم کی ہنسی اور بھی بڑھ گئی۔ رتنا نے ہرن کھری والے جوتے کی ایڑی زمین پر ماری اور پوچھا۔ "کون سی نئی بات ہوئی، جو مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بنے جا رہے ہو؟"

میتم نے ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔ "ہی! ہی! میری گرہست زندگی کی ہر سانس! ہی! ہی! ہر سانس! ہے رام! ہی! ہی! سوگ کی رچناؤں سے بھری ہے! ہی! ہی! میں اپنے کو ہر وقت مبارکباد دیتی ہوں! ہی! ہی! کہ میں نے پریمی میتم! ہی! ہی! ہی! پریمی میتم! ہے بھگوان پریمی میتم! اُف! پریمی میتم کا سا سوامی چنا! ہا! ہا! ہا! ہا! ہا! اور ابھی کل مجھے اپنے کنول سے پاؤں سے ٹھوکر ماری تھی! ہی! ہی! کہ میرے کمرے سے نکل جاؤ! ہا! ہا! ہا! مجھے تمھاری صورت دیکھ کر قے آتی ہے! ہا! ہا! ہا! ہا! ہا! ....."

رتنا نے جھلا کے کہا۔ "تو کیا کہہ دیتی کہ تم بڑے نیچ اور کمینے نکلے! تم میرے پیسوں پر پڑے کھاتے ہو! اور کبھی چار پیسے کمانے کی کوشش نہیں کرتے!"

پیتم نے قہقہہ لگایا "ہا ہا! ہا ہا! پریمی پیتم اور چار پیسے! ہا ہا! ہا ہا! ہا ہا!"

رتنا نے دانت پیس کر کہا۔ "اچھا بس اب چپ رہو! بہت ہنس چکے!"

پیتم نے پیٹ پکڑ کے کہا۔ "مجھے کبھی بھولے سے بھی خیال نہ آیا ——

ہی ہی! بھولے سے بھی! ہی! ہی! کہ مجھے پریم کی قیمت زیادہ دینا پڑی! ہا! ہا! ہا! ہا! ہا!" —— رتنا نے اکبارگی پاس کی چھوٹی میز سے گلدان اٹھا کر پیتم پر کھینچ مارا۔ پریمی نے آہ کر کے سر پکڑ لیا اور وہ دھڑاکے سے کواڑ بھیڑتی اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!"

سنہ ۱۹۴۰ء

جواب

راجہ صاحب رنگیلے بھی تھے اور ہنڈی بھی۔ اُنکے نزدیک اُن کا ہر کام اعتراض سے بالا تھا۔ کسی کو کسی قسم کی شکایت کا حق نہ تھا۔ رعایا، پرجا، تو بھیڑ بکری تھے۔ جانور، ان کے یہاں تو زباں ہی نہ تھی، آلۂ شکایت ہی صدیوں سے کٹا پڑا تھا، وزراء اور افسران نوکر تھے۔ حقِ نمک یہی تھا کہ بلا سوچے سمجھے سرکار کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ اب رہ گئیں رانی۔ تو وہ لاکھ انگریزی پڑھی سہی، برابر کے خاندان کی لڑکی سہی، مگر تھیں تو بیوی ہی۔ ان کا دھرم تھا کہ صبح، شام پتی کے پاؤں کی پوجا کریں۔ انکو مشورہ دینے، اپنی راے رکھنے، اور اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ بھگوان نے انکو راجہ صاحب کا ساتھ ہر دیا، یہ اُسکی عین بخشش و رحمت تھی، اُنکو چاہیے کہ وہ خدا کی اس دی ہوئی نعمت کو، جو اُنھوں نے اپنی پسند، اپنی خوشی، اپنی مرضی سے نہ پائی تھی، مگر جو اُن کے والدین کے ہاتھوں انکے سر منڈھی گئی تھی، کلیجے سے لگا کر بیٹھیں اور دن رات

اسکی خیریت، صحت و عافیت کے دھیان میں لگی رہیں۔

جب ذہنی کیفیت یہ ہو اور جنسی رجحان ان لوگوں کا جو آناؤں، دائیوں، کھلائیوں اور مہریوں کی بدولت قبل از وقت جوان ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کے، یونانی اور انگریزی دوا خانوں کے بھروسے بعد از وقت تک جوان رہتے ہیں، تو پھر راجہ صاحب کے گلچھروں میں کوئی بدھا تھا کہ بادھا ڈالتا۔ کس کے منھ میں دانت تھے کہ اس ہاتھی سے گنا کھاتا۔ اسی لئے وہ جنسی لذات میں ماہر خصوصی تھے۔ انھوں نے بہت سی باتصویر کوک شاستریاں جمع کر رکھی تھیں۔ اُنکی میزوں کی درازوں میں سیکڑوں پیرس کی چھپی ہوئی، عدن و بمبئی میں بکنے والی خاص طرح کی تصویریں تھیں۔ انکے کتب خانے میں التیس کی تمام جلدیں موجود تھیں۔ اور انکا دعوی تھا کہ وہ ہر قوم، ہر ملت، ہر سن ہی کی جنسی لذات سے واقف نہ تھے بلکہ اُنھوں نے اپنے تجربے کے دائرے میں حیوانات و نباتات تک کو شامل کیا ہے۔ اُنھوں نے اسے ایک فن کی طرح حاصل کیا تھا اور ایک سائنٹسٹ کی طرح اسکا تجربہ کیا تھا۔ انکی خواہش تھی کہ وہ اس معاملۂ خاص میں وہ تمام ریکارڈ توڑ دیں، جو ڈان جوان، کاسونووا، مارکو پولو، کوکا پنڈت، ابن بطوطہ اور ہارورڈ ڈالمیس نے قائم کئے ہیں۔

یہی اُن کا مطمح نظر بھی تھا اور یہی اُنکی ضد۔ اس غرض کے پورا کرنے کے لئے اُنکو نئے نئے معمولوں کی تلاش رہتی، اور مقصود کے حاصل کرنے کے لئے

کوئی امر نہ مانع ہو سکتا تھا اور نہ حائل۔ خوشی اور زبردستی تو معمولی الفاظ تھے، دھوکا، جعل، فریب، جھوٹ، یہاں تک کہ قتل و غارت میں بھی عار نہ تھا۔ ایک نئے طرح کے تجربے کے لئے، خواہ وہ ساٹھ سے اوپر سے متعلق ہو یا نوّے سے نیچے سے دو چار اعزا، برادری کا خون زیادہ اہم بات نہ تھی، خود مختار راجہ تھے۔ ان کو کون روک ٹوک سکتا تھا۔

ایک سال تک رانی صاحبہ یہ سب دیکھتی، کُڑھتی، گھٹتی رہیں، مگر اُنھوں نے زبان سے کچھ نہ کہا، لیکن جب راجہ صاحب نے خود انکے میکے سے آئی ہوئی مہریوں، دایوں، کہاریوں کا شکار شروع کر دیا اور اُنھیں کے سینے پر کودوں دلنا، تو انکا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اُنھوں نے راجہ صاحب کو ایسا سبق دینے کا ارادہ کر لیا جو اب تک ان کے خواب میں بھی نہ آیا تھا۔

ایک شام راجہ صاحب اپنی کوٹھی میں بیٹھے ریڈیو سُن رہے تھے۔ دفعتاً انھیں ایک ایسا گانا سُنائی دیا کہ وہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ مغنیہ کی آواز ان کے دل کی گہرائیوں میں اُترتی جا رہی تھی۔ اور اسکی گلے بازی انکی روح کے تاروں پر ناخن مار رہی تھی۔ ان کے جسم بھر میں ایک سنسنی سی محسوس ہونے لگی اور انکے نتھنوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اُنھوں نے گانا ختم ہوتے ہی ریڈیو ڈائرکٹر کو فون کیا۔ گانے والی کا نام پوچھا اور ان سے خواہش کی کہ وہ اتنی دیر تک روک لی جائے کہ انکے آدمی وہاں پہونچ کر اس تک ان کا پیغام پہونچا دیں۔ پھر اپنے ملازم خاص کو بُلا کر اسے

خاص ہدایتیں دیں اور خاص کار رولس رائس لے جانے کا حکم دیا۔ اسکی واپسی تک وہ ریڈیو کو کھلا ہوا چھوڑ کر کمرے میں ٹہلا کئے۔ انھیں آج مدتوں کے بعد انتظار کرنے کی زحمت اُٹھانا پڑی تھی۔ وہ بے چین تھے، وہ جھنجھلائے ہوئے تھے اور وہ مضمحل تھے، انکو آج پہلی دفعہ اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوا تھا، ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ تاریکی میں اچانک ایک اندھے کنوئیں کے کنارے لاکر کھڑے کر دیئے گئے ہیں، جس سے دُور رہنے کی ایک بےچین خواہش دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔

بارے موٹر کا ہارن سُنائی دیا، انجن بند ہوا اور چند منٹ بعد آدمی نے آکر سلام کیا۔
راجہ صاحب نے خوش ہو کر پوچھا "لے آئے؟"

آدمی نے ہاتھ باندھ کے کہا "نہیں سرکار!"

راجہ صاحب نے تیوری چڑھا کر پوچھا، "کیوں؟ کیا بات ہوئی؟"

آدمی نے لرزتے ہوئے جواب دیا "سرکار! انھوں نے کہا میں آرٹسٹ ہوں، پیشہ ور نہیں۔ اگر راجہ صاحب برابر والوں کی طرح ملیں، مجھے ڈنر پر بلائیں، رانی صاحبہ سے ملائیں، ذات برادری والوں کے ساتھ بٹھائیں تو آسکتی ہوں، ورنہ مجھے معاف رکھیں۔"

راجہ صاحب نے پوچھا "دماغ خراب ہے؟ رانی کیوں ملینگی، وہ کہینگی میری توہین ہے!"
سرکار انھوں نے یہی کہا، اور سرکار، وہ اپنی بات پر اڑی ہیں!"

"اچھا، تو یوں ہی سہی! پر گھر جانتے ہو؟"

"جی ہاں سرکار!"

"چلو، ہم خود چلتے ہیں"

موٹر پھر روانہ ہوا، آدھ گھنٹے بعد پٹنا تو راجہ صاحب کے ساتھ ساتھ ایک چمکتی دمکتی ساڑی میں ایک زہرہ وشتری کی زائیدہ بھی تھی۔ اسے وہ بڑے تپاک سے اپنے مرصع ڈرائنگ روم میں ساتھ لائے، اُس نے ادھر اُدھر نظر کی جیسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ پھر راجہ صاحب سے مُڑ کر بولی "آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رانی صاحبہ ضرور موجود ہونگی، مگر میں تو اُنھیں کہیں نہیں دیکھتی!"

راجہ نے کہا۔ "میں ابھی اُنھیں لاتا ہوں"

وہ اندر محل میں گئے۔ رانی سہیلیوں میں بیٹھی تھیں، اُنھوں نے سب کا ایک چھلتی ہوئی نظر سے سلام لیتے ہوئے بیوی سے کہا "میری ایک دوست اس وقت آئی ہیں، چل کر ان سے مِل لو"

رانی نے پوچھا "کون ہیں؟"

راجہ نے کہا۔ "میری ایک دوست ہیں جو آج شام کو ریڈیو پر گائی تھیں"

"میں ایسے لوگوں سے نہیں مِل سکتی!"

"تم کو میرا حکم ماننا ہی پڑیگا"

"میں اسکا پندرہ منٹ بعد جواب دونگی"

وہ غصے میں مُسکراتے باہر چلے آئے۔ مغنیہ نے کہا "کیا وہ نہ آئینگی؟

اگر ایسا ہے تو میں پھر ایک منٹ بھی یہاں نہ ٹھہرونگی۔ میں صرف اُسی کی ہو سکتی ہوں جو مجھے سب سے زیادہ پیار کرے اور جو میری سب سے زیادہ عزت کرے!"

راجہ نے کہا "وہ آ مینگی ——— مگر زیدہ رہ بیس منٹ میں! ۔ جب تک کوئی چیز گا کے سُنا دو۔"

مغنیہ نے لگاوٹ سے مسکرا کے ایک عشقیہ غزل گنگنائی ۔ راجہ صاحب جھومنے لگے ۔ پھر وہ دفعتاً عالم سرور میں رُک کر بولی "رانی تمھارا حکم نہ مانینگی، وہ مجھے رنڈی سمجھتی ہیں۔

راجہ کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا، وہ پھر اُٹھ کر چلے۔ مغنیہ نے کہا "اور میں اکیلی بیٹھی رہوں" وہ ذرا رُک کر بولے "نہیں تم بھی ساتھ آؤ۔"

دونوں جب رانی کے کمرے میں پہونچے تو وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے ہوئے دکھائی دی، مغنیہ جھجھک کر پیچھے رُکی ۔ راجہ نے اُسے کھینچ کر آگے کیا، پھر وہ بولے "رانی ان سے ملو، یہ میری دوست ہیں!"

رانی جھپٹ کر اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی اور وہاں سے ایک جوان سپاہی کو کھینچتی ہوئی لائی، پھر راجہ کے سامنے ہی اُسکے گلے میں باہیں ڈال کر اس نے کہا "راجہ ان سے ملو، یہ آج سے میرے دوست ہیں!"

سنہ ۱۹۴۰ء

بھوک

"کام ملا؟" بوڑھی بھکارن نے دھوئیں سے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! 'جمیدار' کہنے لگا پہلے پورے مہینے کی آدھی مزدوری ہم لے لیں گے اور آدھی صاحب!" جوان مزدورنی "سی، سی" کرتے جواب دیا۔

"کون صاحب؟"

"وہی بڑا میٹ"

"پھر تم نے کیا نہیں کہا کہ تم مہینہ بھر کھاؤ گے کیا؟"

"اُس نے کہا، ہم کیا جانیں، کمانے آنا تھا تو گرہ گانٹھ میں کچھ رکھ کے آنا تھا!"

"تم نے کہا نہیں کہ اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو مزدوری ہی کرنے کیوں آتے؟"

"سب کچھ کہا، پر اُس نے ایک بات بھی نہ مانی۔ بہت گڑگڑانے پر اتنا کہا "اگر پہلے مہینے کی پوری مزدوری نہیں دے سکتے تو تین مہینے تک آدھے آدھے مہینے کی مزدوری دینا پڑیگی۔"

"کتنا ملتا ہے روزانہ ؟"

"یہی چھ آنے"

بھکارن دل ہی دل میں کچھ حساب جوڑنے لگی، پھر بولی "تو تم مزدوروں سے تو ہم بھکاری ہی اچھے، جو دس بارہ آنے روز کما لیتے ہیں۔"

"ہاں، ہاں!" مزدور نے بھکارن کی آگ پر ہاتھ سینکتے ہوئے گردن جھکا کر کہا

بھکارن نے دو روپیہ کرایہ پر کوٹھری لے رکھی تھی۔ کچی دیواریں، کچا فرش، شکستہ چھت، آٹھ فٹ چوڑی، بارہ فٹ لمبی۔ اسی میں اسکا وہ بوریا تھا جو پلنگ کی جگہ کام دیتا تھا اور وہ گودڑ جسے وہ لحاف کی طرح اوڑھتی تھی۔ اسی میں ایک طرف چار گتے رکھکر اس نے ایک چولھا بھی بنا رکھا تھا، جسکے قریب ایک توا تھا، ایک مٹی کا گھڑا اور ایک تاملیٹ۔

بھکارن کا سن کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، یہی چالیس پینتالیس برس کی رہی ہوگی، مگر اسکے چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ اسکی آنکھوں میں کیچڑ بھری تھی، اور اسکی ناک بیچ سے دھنسی ہوئی تھی۔ اسکے بالوں اور اسکے کپڑوں پر جوئیں رینگتی پھرتی تھیں۔ وہ ہر وقت میل سے بھرے، جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے ناخونوں سے یا تو سر کھجاتی، یا بدن کو نوچتی رہتی تھی

مزدور ایک دیہاتی نوجوان تھا، سترہ اٹھارہ برس کا سن، گندمی رنگ، مضبوط ہاتھ پاؤں، کانپور گنگا اشنان کے سلسلے میں آیا تھا۔ یہاں کسی نے اسکی

جیب کاٹ لی اور وہ پورے دو دن سیوا سمتی کے دفتر اور کوتوالی کا چکر لگاتا رہا۔ پھر جب اپنے پیسوں کے ملنے کی طرف سے مایوس ہوا اور بھوک نے بہت ستایا تو کام ڈھونڈھنے لگا۔ سمجھتا تھا بڑا شہر ہے، بیسیوں ملیں اور کارخانے ہیں، کہیں نہ کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ مل ہی جائیگی۔ مگر ہر جگہ ٹھیکیداروں اور جمعداروں کا دور دورہ تھا۔ کام سے پہلے ان کے حق کی گفتگو چھڑ جاتی اور ہر جگہ سے وہ ٹکا سا جواب پاکر مایوس پھرتا۔ تین دن اسی طرح کام کی تلاش میں گزر چکے تھے، اتنے زمانے میں صرف دو مرتبہ ایک آنے کی مزدوری پر ٹیڈ کے بازار کے سلسلے میں بوجھ ڈھونے کی مل گئی تھی۔ اس رقم نے دو دن کے چنوں کا ٹھکانا کر دیا تھا، لیکن کل دن بھر اس نے بالکل فاقہ ہی کیا اور شام کو وہ بھوک اور تھکن سے مجبور ہو کر اس بھکارن کی کوٹھری کے سامنے والے چبوترے پر گر پڑا تھا۔ گو سردی تھی، دسمبر کا زمانہ تھا۔ مگر جوانی کی حرارت نے اسے فالج سے بچا لیا تھا۔ بلکہ وہ شب میں اسی طرح اپنے پھٹے کرتے میں پتھر کے فرش پر تھوڑا بہت سو بھی لیا تھا۔ صبح ہوتے ہی بھکارن اسے جگا کر اپنی کوٹھری میں لے گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی آگ سلگائی تھی اور مزدور نے اس پر ہاتھ پاؤں سینکے تھے۔ پھر بھکارن نے اسے تھوڑے سے چنے دیے تھے اور وہ انھیں کھا کر بھکارن کی ہدایت کے مطابق اس فیکٹری کے پھاٹک پر سارا دن کھڑا رہا تھا جہاں کے لئے مشہور تھا کہ وہاں مزدوروں کی بڑی مانگ ہے۔ اس وقت وہ وہیں سے ناکامیاب پلٹا تھا۔

"پھر اب کیا کروگے ؟" بھکارن نے پوچھا۔

"کل اسی شرط پہ کام کرنا شروع کردونگا، تین مہینے تک تین ہی آنے روز سہی !"

"پر رہوگے کہاں ؟"

مزدور نے گھبرا کر باہر دیکھا۔ آج دفعتاً دوپہر ہی سے ابر گھر آیا تھا۔ بار بار بجلی چمکتی تھی، بار بار رعد گرجتا تھا۔ اس وقت ایسی ایک کڑک ہوئی کہ کوٹھری کی بوسیدہ چھت سے تھوڑی سی مٹی نیچے آتی رہی۔ پھر ساتھ ہی بوندیں ٹپ ٹپ گرنا شروع ہوئیں۔ پھر بجلی چمکی، پھر زور کی کڑک ہوئی اور اولے پڑنے لگے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ان کے دس پانچ دانے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے اس کال کوٹھری میں بکھیر دیے۔ بھکارن نے انھیں جھک کر اٹھا لیا، اور "سو، سو" کرکے انھیں کھایا اور کواڑ بند کرتے ہوئے کہا "اب کہاں جاؤگے، یہیں رہو !"

مزدور نے گھبرا کر کہا۔ "یہاں کیسے رہونگا، ماں !" اور اس نے بھکارن کو متعجب نگاہوں سے دیکھا۔

بھکارن کے چہرے کی جھریاں قریب قریب مٹ گئیں، اسکی دھنسی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے مزدور کو ایک شکاری کی آنکھوں سے دیکھا، پھر ہنس کر بولی "ماں کے جنے ! میں کچھ ایسی بوڑھی بھی نہیں ہوں !"

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب

کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو

جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

حسنین سیالوی: 03056406067

Imagitor

سنہ ۱۹۴۰ء

نقل

صبح کا وقت تھا، آفتاب کا لال لال چہرہ دیکھکر پتیوں، پھولوں کے منھ پر دُھواں سا اُڑنے لگا تھا، سبزے کا نم آنچل سُوکھ چلا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھی گرما گئی تھی۔ چڑیاں چہچہانا اور لڑنا چھوڑکر چارہ چگنے کی فکر میں لگ گئی تھیں، بلوں کی سیٹیاں ہو چکی تھیں۔ مزدوروں کا ریوڑ سڑک سے گاتا، گنگناتا، لپکتا، ہانپتا کھانستا، گالیاں بکتا جا چکا تھا۔ مہتر، مہترانیاں سڑکوں پر جھاڑو دے کر کوڑوں کا انبار جگہ جگہ لگا چکے تھے۔ گنگا گھاٹ پر تڑکے اشنان کے لئے جانے والے اپنے کو پاک و صاف کرکے پلٹ رہے تھے۔ جُھنڈ کے جُھنڈ، غول کے غول ٹیکا لگائے، مالا جپتے، بھجن گاتے، کوئی بھگوان کے دھیان میں، کوئی جل پری کی یاد میں، کوئی سُود بیاج کی فکر میں، کوئی اپنی ٹھکرانی کے پیچھے حفاظت کرتا ہوا، کوئی اُچکا ہر نوجوان عورت کو گھورتا ہوا، یکے تانگے بھی اِکا دُکا چلنے لگے تھے۔ یکہ بانوں کی ٹخ ٹخ، موٹر لاریوں کی پُوں پُوں سُنائی دینے لگی تھی۔ اور بسوں اور لاریوں کے

انجن گرمائے جانے لگے تھے۔ گویا رات کے سکوت کی چادر کو دن کا شور آہستہ آہستہ چاک کرتا جا رہا تھا۔ مگر سکوت میں جو جمود ہوتا ہے وہ اب تک باقی تھا۔ شہر کی ہر شے گویا ابھی تک خواب آلود انگڑائی میں تھی۔

بدھوا بھنگی رات رہے سے جھاڑو دینے نکلا تھا۔ وہ اپنی ایک دروالی کوٹھری میں بیٹھکر ایک چلم تریل پی چکا تھا۔ اب کوڑا گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسکی بھنگن بھی میونسپلٹی کی ملازم تھی، وہ یہاں سے پہلے ہی تھوڑا سا کام کرکے چھوٹے بچوں کا خیال کرکے اپنی کالی کوٹھری میں واپس آگئی تھی۔ چار برس کا ڈلا اکب کا رات کی بابوجی کی دی ہوئی دال اور بھاجی سوکھی روٹیوں کے ساتھ اڑا چکا تھا۔ ڈیڑھ برس کی بسنتی البتہ اب تک ماں کی چھاتی سے کیڑے کی طرح لپٹی تھی۔ ادھر اسکا چار انگل کا پیٹ کسی طرح نہ بھر چکتا، ادھر بھنگن کو کوڑا گھر جانے کی جلدی۔ زرا دودھ چھڑایا اور وہ لگی ٹیں ٹیں کرکے چیخنے۔

بدھوا نے کہا۔ "یہ چھوکری جان کا روگ ہے، ایک نہ ایک دن دم کو نکلوا کے چھوڑے گی۔"

بھنگیا بولی، کیا کریں "آج اس نگوڑی کا کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھر چکتا۔"

"پیٹ کیسے بھرے دودھ بھی تو ہو، نا۔"

"دودھ کیا خاک ہوگا جب پیٹ بھر کھانے ہی کو نہیں ملتا۔"

"تو اسے روٹی دو، چٹانا شروع کرو۔"

"اس وقت تو وہ بھی نہیں، یہ دُلوا پاجی سب چٹ کر گیا۔"

"تو تم جانو اپنا کام، میں تو چلا، نہیں تو وہ سالا جمیدار کھا ہی جائیگا۔"

"وہ اپنی کوٹھری سے نکلا۔ سامنے لوہے کا ٹھیلا میلا ڈھونے والا کھڑا تھا۔ وہ ادھر بڑھا۔ ننگا دلوا ایک پھٹی قمیص پہنے دوڑا۔

"دادا ہم بھی تلیں گے، دادا ہم بھی تلیں گے!"

سدھوا نے ڈانٹا "ارے تو کہاں جائیگا پاجی! تیری ماں کو بھی جانا ہو تو بہن کو تاکنا، ہم دونوں ابھی پلٹ کر آتے ہیں۔"

بچہ مچلا "نہیں ہم تلیں گے۔" بھنگن بھی باپ بیٹے کی جنگ دیکھنے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک ہندوستانی صاحب اور انکی میم۔ صورت شکل میں کچھ ان غریبوں سے اچھے نہ تھے۔ ہاں مگر کپڑے ستھرے تھے۔ صاحب صبح کے گرم سوٹ میں منھ میں چرٹ دبائے تھا، میم ریشمی ساڑی پر ایک لال بیر بہوٹی کے رنگ کی سوئٹر کوٹ ڈالے تھی۔ انکا ننھا بچہ ایک پرمبولیٹر میں تھا۔ دونوں اسے ٹھیلتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے پاس آکر بھنگی، بھنگن اور انکے بچوں پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالی۔ گویا نظر بھر کر دیکھنے میں آنکھوں کے گندہ ہو جانے کا ڈر تھا۔

میم صاحبہ نے کہا "اوہ، یہ لوگ کتنا میلا ہے"۔ اور ایک ہلکی تحقیر آمیز

ہنسی کے ساتھ ایک چھوٹے سے سفید رومال سے ناک چھپالی۔

ڈلوا نے تالی بجا کر کہا "واہ! ہم گاڑی میں تلیں گے! ہم بھی گاڑی پر تلیں گے"۔ سدھوا نے مسکرا کے میکیا کو دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں بھی ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ کوٹھری کی کنڈی چڑھا کے آکر برابر کھڑی ہو گئی۔ سدھوا نے ڈلوا کو اُٹھا کر ٹھیلے والے ٹھیلے میں بٹھا دیا۔ میکیا نے بسنتی کو اس بچے کی گود میں دے دیا پھر دونوں قدم سے قدم ملاتے ہوئے ٹھیلے کو ٹھیلتے بالکل صاحب لوگوں کی طرح کوڑا گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

باجی ڈلوا راستہ بھر اس طرح ٹخ ٹخ کر کے یکوں تانگوں کی اور پوں پوں کر کے موٹر لاریوں کی نقل کرتا کہ دونوں کی خوشی سے باچھیں کھل جاتی تھیں اور ایسا جان پڑتا جیسے وہ ٹھیلے کے ٹھیلے کو نہیں لئے جا رہے ہیں۔ بلکہ پنڈت تویج دیو بھولا کا بنایا ہوا، پھولوں سے لدا آسمانی رتھ ہنکا رہے ہیں!۔

سنہ ۱۹۴۰ء

کوڑا گھر

صبح کے سات بج رہے تھے۔ مسجدوں سے تسبیح و تہلیل کی صدا، مندروں سے ناقوس اور گھنٹوں کی آواز اب نہ سُنائی دیتی تھی، وولن مل کی ساڑھے چھ والی سیٹی بھی کب کی بج چکی تھی۔ مزدوروں کا دل بھی جا چکا تھا۔ میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی بھی اپنا پیٹ بھر کر ڈکارتی سدھار چکی تھی۔ اب سڑک پر سناٹا تھا، اس طرح کا سناٹا جیسا بیوہ کے دل میں ہوتا ہے۔ بھیانک، اُجاڑ، زندگی کے ہنگاموں سے خالی!

دفعتاً اس خاموش سڑک پر گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور تین مہترانیاں چھوٹی چھوٹی آہنی ٹھیلا گاڑیاں لئے ہوئے نمودار ہوئیں، اُنکی منزل وہی کوڑا گھر تھا۔ جواب سے پہلے مہتروں کے جھنڈ کو خوش آمدید کہہ چکا تھا۔

مہترانیوں کی پوشاک قریب قریب ایک ہی طرح کی تھی۔ لہنگا، شلوکا، ڈوپٹہ کثیف، گندہ، متعفن! پھر بھی اُن میں چھیڑ چُھل برابر جاری تھی۔

سنوں میں یوں ہی سا اُبل تھا۔ تیس، پچیس، بیس: بجھتی ہوئی دھوپ، ڈھلتی ہوئی دھوپ اور چڑھتی ہوئی! مگر گرمی سب میں تھی کسی میں نرم، کسی میں مدھم، کسی میں تیز!

تینوں آکر اپنی منزل پر ٹھہریں، وہی کوڑا گھر!

ایک ٹھیلے گاڑی سے بھوڑا نکالا گیا۔ آپس میں ہنس کر بحث ہونے لگی۔ سوال یہ تھا کہ کوڑا گھر میں گھس کر بھوڑے سے گاڑیاں لادے کون؟

سب سے بڑی نے کہا۔ "آج تو کوڑا سکھو کی ماں کو لادنا چاہیئے"۔

مجھلی بولی۔ "واہ بھوجی واہ! ہر سٹے مجھی سے محنت لینا چاہتی ہو، رات بھر تمہارے بھتیجوں اور بھائی کی سیوا کروں، دن بھر تم بھوڑا چلواؤ!

واہ بھوجی واہ، اچھی کہی!

بڑی نے آنکھ مٹکا کے کہا۔ "تو تم رات بھر بھائی کی سیوا کر دبی کیوں؟ بھڑوا دے ہی کیا دیتا ہے! جب دیکھو تاڑی پی کے اول فول بکتا پھرتا ہے۔ یا پھر ہر چھٹے مہینے تمہارے مرنے کو ایک لڑکا کھڑا کر دیتا ہے!"

چھوٹی ہنس کر بولی "اور جو سکھو کی ماں ہی کا من چاہتا ہو کہ وہ سکھو کے ساتھ ساتھ منگلو کی ماں بھی بنیں۔ جھگڑو کی بھی اور للو کی بھی!"

سکھو کی ماں غصہ کا چہرہ بنا کر اُسکی طرف جھپٹی "رہ تو جا، پاجی، بانڑی! بانجھ!"

بڑی بولی۔ ”تو اس کے کوئی چھیتھڑا بھی نہ ہوا تو اس میں اس کا کیا دوش؟ رام لال بیچارہ جوان ہوتے ہی چل بسا، اور یہ اب تک یونہی بیٹھی ہے۔“

سکھو کی ماں نے کہا۔ ”دوش کیوں نہیں؟ سب اسی کا پاجی پن ہے۔ ارے یہ بڑی نٹ کھٹ ہے۔ اس نے چار حرف ہندی کے جو پڑھ لئے ہیں، بس اب یہ شہزادے کی آس لگائے بیٹھی ہے۔ کسی شہزادے کی! اسکے یہاں تو وہی مثل ہے ”صورت چڑیل کی اور دماغ پریوں کا!“

جوان مہترانی نے ہنسکر سکھو کی ماں کا ہاتھ تھام لیا، اور کلائی مڑوڑ کر بولی ”کیوں ری، ہمارا دماغ پریوں کا ہے؟“

وہ چیخی ”ارے کلائی ٹوٹی! چھوڑ کلائی! بانڑی نگوڑی! بھلا بھینس ہو رہی ہے! ارے، آہ!“

بڑی تالی بجا کے تھرکنے لگی ”ارے سیّاں، میں تورے لگوں پیاں، چھوڑ موری بہیاں، چھوڑ موری کلیاں۔ ارے چھوڑ موری کلیاں!“

سکھو کی ماں نے کراہتے، آہ، آہ کرتے، کوستے، گالی دیتے ہوئے ایک بار گھبراہٹ کا چہرہ بنایا۔ ”ارے دیکھ، وہ جمیدار آ رہا ہے۔“

جوان مہترانی کے ہاتھ سے منجھلی کی کلائی بالکل اسی طرح چھوٹ گئی، جس طرح نورجہاں کے دستِ سیمیں سے کبوتر چھوٹ گیا تھا۔

وہاں اگر معصومیت، بھولے پن اور سادگی نے گرفت کو ڈھیلا کیا تھا، تو یہاں پرمٹ کے ڈر، نوکری کے خطرے نے! ۔۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خالی سڑک اسی طرح دھوپ میں چمک رہی تھی جیسے کسی بوڑھی بیگم کے سفید بال! دونوں مہترانیاں ہنسنے لگیں۔ اور وہ کھسیانی سی ہو گئی۔ اسکے چہرے پر جھینپ کے بعد والا غصہ جھلکنے لگا۔

اس غصے کی وجہ صرف یہی نہ تھی کہ وہ چرکا کھا گئی تھی اور سکھو کی ماں نے اسے بیوقوف بنا لیا تھا، بلکہ اس غصے کی تہ میں "بانڑی" اور "بلا بھینس" کے لفظوں کی چبھن تھی، یہ دونوں لفظ کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے، آج اگر اسکے پاس جھگڑو، للو، سکھو کے ایسے دو چار جنے ہوتے تو بھلا اسے کیسے کوئی بانڑی کہتا، کیسے بلا بھینس پکارتا۔ وہ اس وقت سکھو کی ماں کو تو مزا چکھا ہی دیتی! وہ جھپٹ کے آگے بڑھی۔

بڑی مہترانی مجبوری سے بیچ میں آ گئی۔ وہ بات رفع دفع کرنے والے لہجے میں بولی "اب تو تم نے سکھو کی ماں کے ہاتھ مروڑ مروڑ کے توڑ ہی دیے۔ اب تم ہی ٹھیلے بھر دو!"

جوان مہترانی نے خاموشی سے پھوڑا اٹھا لیا۔ کوڑا گھر کا پھاٹک کھولا، لہنگا اٹھا کر آگے سے سمیٹا اور پیچھے کھونس لیا، پھر وہ کوڑے کے انبار پر بالکل اسی طرح پل پڑی جس طرح معلم سرخ پنسل لیکر طلاب کے مضامین کی

اصلاح پر جھک پڑتے ہیں !۔

اس نے ایک منٹ دم نہ لیا۔ اس نے چند ہی لمحوں میں تینوں تھیلے بھر دیے
بڑی اور منجھلی اپنے اپنے تھیلے لیکر اس طرف چل دیں۔ جدھر میونسپلٹی
پرانا تالاب پٹواکر "ہریجن نگر" بنانے والی تھی۔ وہ دروازہ بند کرتے اور
اور لہنگے اور پاؤں سے گندگی جھاڑنے کے لیے رُک گئی۔ اس نے کوڑا گھر سے
نکل کر لہنگے کا ازار بند کھولا، اور نیچے گھسے ہوئے جمپر کو جھٹکا دیکر آگے
لائی اور ریشے کی شکن برابر کرکے کمر بند باندھنے لگی۔

"ارے بھوجی یہ نازک کمر اس طرح نہ کسا کرو، نہیں تو ٹوٹ جائیگی !

یہ ایک نوجوان مہتر تھا۔ ٹانگوں میں میلی سی دھوتی، جسم پر پھٹا ہوا
کُرتہ، گردن میں ایک لال چٹ، اور کان میں آدھی جلی ہوئی بیڑی !——
سوکھا، بدصورت، ہو بہو مہتر، سر سے پاؤں تک مہتر، بالکل مہتر——
مگر جوان !—— رانڈ کے سے سانڈ !۔

جوان مہترانی کمر بند میں گرہ لگاتے ہوئے ٹھسک کر "تم تو ہمیں چھیڑو گے"
والے انداز میں بولی "ہٹو یہ تمہارا ہر رستے کا چھیڑنا ہمیں نہیں بھاتا !"

وہ اپنے میلے دانت نکال کر بولا "تو بھوجی ہم سے قسم لے لو، جو ہم
خالی خولی دلگی کرتے ہوں، ہم تو تم سے سگائی کرنا چاہتے ہیں۔ تم ہی تو نخرے
کرتی ہو —— ارے بگی یہ جوانی کے دن بہت جلد بیت جائیں گے"

وہ تنک کر بولی۔ "تو بیت جائیں کس کو پروا ہے!"

وہ ذرا متانت سے بولا۔ "تم کیا جانو کہ پُرش استری کے ملاپ میں کیسی آگ ہے، جس سے گھر جلتے نہیں، بستے اور بنتے ہیں!"

وہ آنکھیں چمکا کر بولی۔ "ارے ہم کچھ نہیں جانتے، پر اتنا جانتے ہیں کہ تم کو شہر میں رہ کے باتیں اچھی بنانا آگئی ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "ارے بھوجی، ہم بات ہی نہیں بناتے، ہم استری بھی اچھی بناتے ہیں، تم بن کے دیکھ لو۔!"

وہ لاجواب ہو کر بولی "تم کیا ہمیں استری بناؤ گے، ہم تو تمہارے مُنہ پر تھوکیں بھی نہیں!"

نوجوان مہتر بالکل اُسی شان سے آہستہ آہستہ بڑھا جس شان سے مُرغ نئی مرغی کی طرف بڑھتا ہے۔

مہترانی "دیکھو، اچھا نہ ہوگا" کہتی پیچھے ہٹی۔ مہتر نے ہاتھ بڑھا کر اسکی کلائی تھام لی۔ "کان کھول کے سُن لو جی۔ خوشامد سے نہ مانو گی تو میں زبردستی کروں گا!"

وہ آنکھیں پھیلا کے بولی۔ "دِن دِہاڑے، سڑک پہ!"

وہ بے پروائی سے بولا "اونہہ، کیا ہوا! پکڑے جائیں گے تو سب یہی کہیں گے کہ مہتر بھنگی ہے پنج ذات! جیل بھی جائیں گے تو وہاں بھی

یہی کام کرنا ہو گا!"

"اور میرا کیا ہو گا؟"

"تم کو سب برادری سے نکال دیں گے۔"

"ہم کاہیکو نکالے جائیں، تم نکلو!"

"اچھا تو پھر قول دو کہ آج رات کو مہیلس کے پیچھے ملو گی۔"

"اچھے آئے قول لینے والے!"

اس نے کلائی مروڑی "دے زبان!" شتر گربہ بھی، مگر لب ولہجہ پیار کا اصرار تھا۔ مہترانی اس طرح ہانپنے لگی جیسے وہ سر پہ وزنی بوجھ لادے ایک ختم نہ ہونے والے زینے پر چڑھ رہی ہو۔ مہتر کی آنکھیں اور چمکنے لگیں۔ مہترانی کی پلکیں بھیگ چلیں۔

اتنے میں موٹر کا ہارن سنائی دیا۔ دونوں نے پلٹ کے دیکھا۔ دور سے اگلا حصہ سورج کی کرن میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے تاریکی میں جنگلی جانور کی آنکھیں۔ مہتر نے کلائی چھوڑی، آہستہ سے کہا۔ "آئیگی نا؟ ہاں کہہ دے! بھگوان قسم ابھی بزار سے تیرے لئے وہ چھماکتا ہوا لہنگا خریدوں کہ برادری بھر میں کسی کے پاس نہ نکلے!"

مہترانی نے سر جھکا کر گردن ہلا دی۔

مہتر کی باچھیں کھل گئیں، وہ جھومتا ہوا، گنگناتا ہوا، چمکتے ہوئے

موڑ سے آنکھیں لڑاتا ہوا چل دیا۔ مہترانی اُسکی پیٹھ کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی، کہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا موڑ اسکے پاس آگیا۔ اس نے اس پر چھپلتی ہوئی نظر ڈالی، آگے کی سیٹ پر ڈرائیور تھا۔ پیچھے کی سیٹ پر تین ہندوستانی عورتیں "آپ ٹو ڈیٹ" قسم کی۔ انگریزی شان کے بال، گالوں پر پاؤڈر، ہونٹوں پر لالی، گانوں میں ہیروں کے بُندے، اور جسم میں خوبصورت ریشمی ساریاں۔

مہترانی کو اتنی بیش قیمت ساریاں ایک ساتھ دیکھکر کچھ اچنبھا سا ہوا وہ مُنھ کھولے، ٹکٹکی باندھے ان عورتوں کو دیکھنے لگی۔ موٹر والیاں مہترانی کی اس حیرت و حسرت بھری نگاہ پر مُسکرادیں۔ ان میں سے ایک نے "چھی چھی!" کہا اور موٹر کے باہر تھوک دیا ——— اور سب نے سینٹ سے بسے ہوئے ریشمی رومالوں سے نتھنے چھپالئے!

مہترانی کا جسم کسی خاص جذبے سے کانپنے لگا۔ اسکی جھکی ہوئی آنکھیں اسکے پاؤں پر جم گئیں۔ وہ ننگے تھے اور کیچڑ، گوبر اور گندگی سے اٹے ہوئے۔ انکی اُنگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ انکی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے گھبراکر اپنے ہاتھوں کو دیکھا، ہتھیلیوں میں جگہ جگہ گھٹے پڑے ہوئے، انگوٹھی اور چھلے کی جگہ کوڑے اور مٹی کے گول اور لمبے دھبے تھے۔ وہ پھر ایک بار کانپی اور اُس نے جھاڑو زمین پر پھینک کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا!

اُسے خشک سسکیاں سی آنے لگیں، وہ تیورا کے زمین پر بیٹھ گئی۔

بیٹھنے میں اُس کا پاؤں اسی تھوک پر پڑ گیا، جو موٹر والیوں کی طرف سے اُسکی صورت اور اُسکے کام کے صلے میں انعام کے طور پر ملا تھا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اُسکا پاؤں سانپ پر پڑ گیا ہو، وہ جھجھک کے پیچھے ہٹی۔ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی، پھر وہ پھوڑا کندھے پر رکھ کے چند قدم موٹر کے پیچھے لپکی۔ اس نے دیکھا تو وہ دُور نکل گیا تھا، اس نے "اخ تھو" کر کے سڑک پر تھوک دیا۔ پھر وہ مُسکراتی ہوئی ٹھیلے گاڑی کی طرف آئی۔ اور اُسے ٹھیل کے سڑک پر چلی۔ وہ کوڑے گاڑی کو ٹھیلتی جاتی تھی اور آپ ہی آپ مُسکراتی جاتی تھی۔ شاید وہ بمپلس کے پیچھے اپنے کو ایک پھڑکتا ہوا لہنگا پہنے اپنے مہتر شہزادے کے سامنے ناچتی ہوئی دیکھ رہی تھی!۔

سنہ ۱۹۴۱ء

۲ دو بچے

نواب صاحب پوتڑوں کے رئیس تھے، باپ دادا لاکھوں کے جاگیردار رہ چکے تھے، وہ بات تو اب نہ تھی، مگر ٹھنے مٹانے پر بھی بہت کچھ تھا۔ اس لیے رکھ رکھاؤ، آن بان وہی تھی۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، خواصیں، مہریاں، سب ہی تھیں۔ محل بھی ایک نہیں کئی تھے، لیکن بچہ صرف ایک ہی تھا۔ دو برس کی جان، ماں باپ کی آنکھوں کا تارا۔ بڑے اللہ آمیں سے پالا جا رہا تھا۔ جہاں بیگم صاحبہ کی گود سے اترا، اناؤں، دائیوں، کھلائیوں کے حصار میں گھر گیا، ہر وقت یہی خیال کہ کمرے سے باہر نکلے اور گرمیوں میں تیز دھوپ سے سنولا نہ جائے۔ اور جاڑوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا "نزلے کی تحریک" نہ پیدا کر دے۔ اناؤں اور کھلائیوں پر بھی تاکید تھی کہ ہر وقت صاف ستھری رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ بچے کے مزاج میں گندگی کے برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے! ہر وقت یہ قدغن کہ مٹی دھول میں کھیلنے نہ پائے، اگر ننھے ننھے صندل کے پاؤں سے

چلایا بھی جائے تو وہ بھی اندر کمرے کے قالین پر، یا مسہری کے مخملی گدوں پر!

بچہ خوش قسمت تھا کہ وہ ان بندشوں پر بھی لُد پھُد، لُد پھُد چلنے بھی لگا، اور تُتلا کے چھوٹے چھوٹے فقرے بولنے بھی لگا۔ اِسکی بھولی بھولی صورت، اور اس کا یہ تُتلانا اتنا پیارا معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت بیگم صاحبہ اور نواب صاحب کو "ماشاءاللہ، ماشاءاللہ، خدا نظرِ بد سے بچائے" کہہ کہہ کر نہ جانے کتنی دفعہ "نادِ علی"، "جوشنین" اور بہت سی دُعائیں دَم کرنا پڑتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر وہ ایک دوسرے کو دیکھا بڑے یقین سے کہتے تھے۔

"ماشاءاللہ بڑا ذہین ہوگا۔"

"اللہ اس پر حضرت عباسؑ کے عَلَم کا سایہ رکھے، یہ جوان ہو کر قیامت ڈھائیگا!"——

اور نواب صاحب اپنے قیامت ڈھالنے والے واقعات مسکرا مسکرا کر یاد کرنے لگتے تھے۔

غرض ننھے نواب پر ماں باپ جان چھڑکتے اور ہر وقت اس بچے کی صفائی، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، ہر امر کا خاص اہتمام رکھتے تھے——

کہ ایک دن محل میں بجائے بوڑھی مہترانی کے اُسکی پوتی آئی، یہی کوئی چھ سات برس کے سن کی، میلے کپڑے پہنے، ایک چھوٹی سی کوڑا اُٹھانے کی بالٹی لئے ہوئے۔ دادی بیمار پڑ گئی تھی اِس لئے ساٹھ برس کی بوڑھی کے کام کی

ذمہ داری اِس ننھی سی جان پر آ پڑی تھی۔ ڈرتی، سہمتی، جھجکتی، گھبراتی آئی اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنے فرائض ادا کرنے میں منہمک ہو گئی۔

ننھے نواب نے آج پہلی دفعہ اپنے سن سے نسبتہً قریب تر عمر کی ایک لڑکی دیکھی، اناکی گود سے اُتر کر فرش کے کنارے تک لُد پُد، لُدپد کرتے آئے۔ دونوں بچوں نے ایک دوسرے پر سر سے پاؤں تک نظریں ڈالیں۔ چھوٹی مہترانی کی آنکھوں سے اِس صاف ستھرے بچے کو گود میں اُٹھا لینے اور پھول سا مُنہ چوم لینے کی بے چین خواہش ظاہر تھی، ننھے نواب کے ہاں تعجب تھا۔ اتنے چھوٹے لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کے بال انھیں کی طرح سیاہ، جن کے ہاتھ پاؤں انھیں کی طرح چھوٹے چھوٹے، اگرچہ بالٹی سے کھیل سکتے ہیں، گھر کی سب سے زیادہ دلچسپ چیز کوڑا، جس میں تنکے بھی ہیں، کاغذ بھی اور میووں کے ٹکڑے بھی، یوں سمیٹ کر لے جا سکتے ہیں۔ دوستی کرنے کے لئے مُسکرا دیے۔ اَنا نے جو یہ تیور دیکھے ڈانٹا "نواب اُدھر کہاں جا رہے ہو، مہترانی ہے، گندی، چھی! چھی! چھی!"

ننھے نواب نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑے چھوٹی مہترانی کو بغور دیکھتے رہے، اور جب وہ کوڑا لے کر باہر چلی گئی تو انا سے پلٹ کر بولے "مہ تلانی۔ تلی گئی!"

وہ بولی "ہاں نواب وہ موئی دفان ہوئی! لو تم اپنے کھلونے کھیلو،

اس گندی چھوکری کی فکر نہ کرو!"

دوسرے دن ننھے نواب کمرے کے فرش پر اپنی گڑیا سے دوسری دایہ کی نگرانی میں منہمک تھے کہ پھر چھوٹی مہترانی آئی، ان کا گلاب سا چہرا خوشی سے بالکل بیر بہوٹی کے رنگ کا ہو گیا، وہ ایک مرتبہ ننھے ننھے ہاتھوں سے تالی بجا کر بولے "مہ تلانی، میلی (میری) مہ تلانی آگئی!"

پھر بیگم صاحبہ کے پاس دوڑ کر خوشخبری سنائی۔ "امی! امی، مہ تلانی آگئی!"

انھوں نے اس گلنار چہرے کو چوم کر کہا "امی تیرے صدقے! لیکن بیٹے مہترانی کے آنے پر اتنی کیوں خوشی ہے! وہ تو گندی، میلی، کالی، اور خراب ہے......."

بچے نے گھبرا کر کہا "کھر۔ آب، نہیں۔ میلی ۔ مہ تلانی ——— اچھی! ——— بہت اچھی!"

وہ بولیں۔ "وہ موئی کیا اچھی ہو گی! وہ البتہ اچھی ہو گی جسے میں بہو بنا کر لاؤں گی! چاند سی ہو گی، چاند سی!"

ننھے نے کہا "چاند سی؟ چندا ماؤں سی!"

وہ کلیجے سے چمٹا کر بولیں "چندا ماموں سے بھی کہیں زیادہ اچھی!"

تیسرے دن ننھے نواب نے قیامت ڈھا دی۔

پھوہڑ چھدری مہترانی آئی، اُس نے کمرے کے سامنے جھاڑو دی، حسرت بھری نگاہوں سے اس پھول کو دیکھا جسکی وجہ سے کمرہ گلدان بنا ہوا تھا اور جھپٹی بالٹی میں جھک کر کوڑا رکھنے لگی۔ ننھے نواب پہلے تو اُسکی حرکتیں تعجب سے دیکھتے رہے پھر ایک بار لُدپھد، لُدپھد دوڑے اور اُنھوں نے اپنی دونوں باہیں مہترانی کی گردن میں ڈال دیں۔

بس گھر بھر میں زلزلہ آ گیا۔

انائیں، دائیاں، مہریاں، خواصیں، مامائیں سب ایک ساتھ دوڑیں، خود بیگم صاحبہ مسہری سے اُتر کر ننھے کی طرف لپکیں۔ نواب صاحب نے بیچوان ہاتھ سے پھینکا اور "ارے، رے! توبہ! توبہ!" کہتے ہوئے اسی طرف چلے۔

بیچاری چھدری مہترانی عجیب مخمصے میں پھنس گئی، اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی کہ کہیں ننھے نواب گر نہ پڑیں۔ ہاتھ سے چھو نہیں سکتی اس لئے کہ بچہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے اچھوت ہونے سے واقف تھی۔ غرض وہ بالکل بُت بنی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بڑی انا نے بڑھ کر ننھے کے ہاتھ اسکے گلے سے الگ کئے اور اسے گود میں لیتے ہی مہترانی کو ایک لات جڑ دی۔

"حرامزادی، نواب کو سر سے پاؤں تک نجس کر دیا!"

دوسری ماما دائیوں نے بھی گالیوں کی ایک باڑھ ماری اور جوتیوں لاتوں سے تواضع کی، بیگم صاحبہ کی طرف سے بھی خطابوں کی بارش ہوئی۔ اور

چھوٹی مہترانی روتی، بسورتی، بلکتی، سسکتی، بالٹی سمیت باہر بھاگی۔

بیگم صاحبہ بولیں "اس قطامہ سے کہ دو کہ اگر آج سے محل میں قدم رکھا ہے تو کتوں سے بوٹیاں نچوا دونگی! کمینی!"

نواب صاحب بولے "ارے بھئی ننھے کے سارے کپڑے اتار کر پھینکا دو اور اسے خوب نہلا کر دوسرے کپڑے پہناؤ!"

بیگم صاحبہ نے کہا "اور دیکھو منڈے میں ملنے کے لئے صابنوں کی ایک نئی بٹی اور آدھ پاؤ بیسن نکال لو!"

بوڑھی انا نے کہا "سرکار، قربان جاؤں! تھوڑا ماش اور کڑوا تیل بھی صدقے کے لئے ایک ٹوکری میں نہ رکھ لاؤں؟"

بیگم نے کہا "ہاں بوا ضرور! اور اسی ٹوکری میں ایک نیا روپیہ اور چاندی کی چونی بھی رکھ دینا۔ بلا گلے ہی سے چمٹ گئی تھی! خدا نے بڑا فضل کیا جو میرا لعل بال بال بچ گیا!"

ننھے نواب یہ سارا ہنگامہ ایک فلسفی کی متانت سے دیکھا کئے۔ پھر انھوں نے اپنے باپ کی طرف پلٹ کر اپنے نزدیک سب سے اہم خبر سنائی۔

"نیلی، مہترانی بھاگ گئی!"